گاہے گاہے باز خواں ایں قصہ پارینہ را
کشمیر میں
مسلمانوں کو اقلیت میں تبدیل کرنے کی سازش
پس منظر اور پیش منظر
ہندو فرقہ پرستی اور تعصب کی طوفانی یلغار
از: عبدالرحیم راتھر ایم اے

چھپا کر آستیں میں بجلیاں رکھی ہیں گردوں نے

عنادِل باغ کے غافل نہ بیٹھیں آشیانوں میں

وطن کی فکر کر ناداں مُصیبت آنے والی ہے

تیری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں

(اقبال رح)

ے من میں بلراج پوری جیسے غیر مسلم جموی سیاسی کارکن بھی شامل تھے۔ ملک میں اس طوفان بدتمیزی کے خلاف واویلا شروع کر دیا تھا۔ بلراج پوری نے اس سانحے پر ایک مضمون دلی کے اخبارات میں شائع کر دیا۔ "حفاظتی فوج کے لئے دو تالیاں" اس میں کہا گیا کہ فوج نے حملہ آوروں کو مار بھگانے میں جو کارنامے انجام دیئے اس کے لئے اسے مرحبا اور شاباش کی دو تالیاں ملنی چاہئیں مگر تیسری تالی اس وقت بجے گی جب ان ریاستی باشندوں کو واپس آنے دیا جائے جنہیں صرف مسلمان ہونے کی پاداش میں سرحد پار دھکیل دیا گیا ہے۔ صادق صاحب تک بھی یہ آوازیں پہنچ گئی تھیں اور اس کی گونج قومی اور بین الاقوامی سطح پر سنائی دینے لگی تھی۔ چناں چہ ابھی ڈی۔پی۔ در لونچھ میں ہی تھے کہ صادق صاحب نے ان کے پیروں کے تلے بچھائی ہوئی چٹائی کھینچ کر ان سے وزارت داخلہ کا قلمدان چھین لیا۔ ڈی۔پی۔ در اس اچانک حملے سے تیورا گئے اور روتے پیٹتے سری نگر بھاگے۔ صرف اس سازش کی قلعی کھلنے پر ۷ ہزار مسلمان سرحد پار سے آکر پھر اپنے گھروں کو لوٹ آئے اور یہ سازش بھی دھری کی دھری رہ گئی۔ یاد رہے کہ اس سے قبل ڈی۔پی۔ در نے علی الاعلان کہا تھا کہ جو شخص سرحد پار کر کے واپس گھر لوٹنے کی کوشش کرے گا اسے گولی سے اڑا دیا جائے گا۔ لیکن بعد میں جے پرکاش نرائن کے نمائندے احمد فاطمی مس ٹھاکر وغیرہ آگئے۔ اس کے علاوہ کچھ روشن خیال جموی دوستوں نے بھی احتجاج کیا اور ان ہی کی تحریک پر لال بہادر شاستری نے ۷ ہزار ریاستی مسلمانوں کو پھر واپس آنے کی اجازت دیدی۔ انہی دنوں کشمیری مسلمانوں کے پرانے بیری اخبار "ملاپ" کے مہاشہ رنبیر نے یہ شرانگیز اور فساد انگیز تجویز پیش کی کہ کشمیر کو اگر محفوظ بنانا ہے تو وہاں سے مسلمانوں کو نکال باہر کر دینا چاہیئے۔ رنبیر نے لکھا کہ کشمیر میں کل بیس پچیس لاکھ مسلمان بستے ہیں اور ہندوستان جیسے بڑے ملک میں ان کا بٹوارہ کر کے ان کو منتشر کرنا اور الگ الگ ریاستوں میں بسانا کوئی بڑی بات نہیں۔ وہاں یہ لوگ اپنی آواز بھی کھو دیں گے اور اپنی انفرادیت بھی۔ دوسری طرف سے ان علاقوں کے ہندوؤں کو کشمیر میں لا کر بسایا جا سکتا ہے۔ اور ایک "پوران ہندو" کشمیر بھارت کے لئے سب سے بڑی خوش نصیبی ہوگی۔ "ملاپ" نے اپنے عندیے کی پشت پناہی کے لئے یہ دلیل دی کہ عالمی جنگ کے بعد جب روس کو آرمینیا میں مقامی آبادی کی ناراضگی سے دوچار ہونا پڑا تو اس نے فوراً اس صوبے کا تناسب بدلنے کے لئے اس کے بڑے حصے کو سارے روس میں بکھرا دیا۔ ان کی جگہ دوسرے صوبوں کے لوگ آرمینیا میں بسائے اور چین کی بانسری بجانے لگا۔ "ہندوستان کے لئے بھی یہی نسخہ ہے کہ وہ کشمیر کو کشمیری مسلمانوں سے خالی کرا دے۔"

۱۹۶۷ء میں سری نگر میں ایک پنڈت لڑکی پرمیشوری ہنڈو کے پروین اختر بن جانے کے معمولی واقعہ کو ملک اور

ریاست کے فرقہ پرستوں نے اچھالا اور ریاست میں پھر شدھی اور سنگھٹن کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ جموں میں ایک شاہراہ پر گملے کا سر چھوڑا گیا تاکہ ہندوؤں میں اشتعال پیدا ہو۔ جن سنگھی کارکنوں نے جلسوں میں یہ لغو اطلاعات اچھالنا شروع کیں کہ شیتل ناتھ مندر میں ایک سو کشمیری پنڈتوں کی لاشیں انتم سنسکار کے لئے پڑی ہوئی ہیں۔ مسلمانوں کو ریاست سے نکالنے اور انتقام لینے کی پرانی آوازیں پھر بلند ہونے لگیں۔ لوٹ مار شروع ہو گئی اور جن سنگھی خون کے بدلے خون کے نعرے بلند کرنے لگے۔ صورت حال کو بلراج مدھوک کی اشتعال انگیزیوں نے اور بھڑکا دیا۔ یہ شخص ۱۹۴۷ء کے فسادات میں جموں کے قتل عام کا ایک بڑا ولین رہا تھا۔ اور اسی لئے شیخ محمد عبداللہ کی حکومت نے اسے ریاست بدر کرنے کے احکامات جاری کر دیئے تھے۔ اس کے بعد یہ بار بار ریاست میں مسلمانوں کی وطن دشمنی کا رونا روتا رہا۔ اس نے بار بار مطالبہ کیا کہ "پاکستانی ذہنیت کے حامل" کشمیری مسلمانوں کو سرحد پار دھکیل کر کشمیر کو ایک ہندو اکثریت کی ریاست بنا دیا جائے۔ کیونکہ اسی صورت میں "بھارت ورش" کا یہ شمالی قلعہ محفوظ و مامون رہ سکتا ہے۔ اس نے ۱۹۶۷ء میں پھر جموں میں نفرت کی آگ پر اشتعال انگیزی کا تیل چھڑکا اور مسلمانوں کے اخراج کا کھلم کھلا مطالبہ کیا۔ مدھوک کہتا رہا کہ مسلمان اپنے مقدس مقامات کے لئے عرب کی طرف دیکھتے ہیں اور حج کے لئے جاتے ہیں۔ لہٰذا وہ کبھی ہندوستان کے وفادار نہیں بن سکتے۔ کشمیر ہندوؤں کا تیرتھ ہے اور مسلمانوں نے اس کو اپنے وجود سے ناپاک بنا دیا ہے۔ ان لوگوں کو زبردستی سرحد پار پھینک دینا چاہیئے۔ کشمیر میں ہندوؤں کو لا کر بسانا چاہیئے۔ اور بقول ان کے اس فتنے کا سر ہمیشہ کے لئے کچلنا چاہیئے۔ لیکن پھر ملک اور ریاست کے سمجھدار عناصر آڑے آگئے اور اس طوفان کا منہ ایک اور بار موڑ دیا گیا۔

اس ساری تواریخ کے پس منظر میں ان کوششوں اور سازشوں پر نظر ڈالنا ہر محب وطن اور سیکولر کشمیری اور ہندوستانی کا فرض بن جاتا ہے جو یہ عناصر بار بار سر اٹھا کر اپنے پرانے منصوبوں کی تکمیل کے لئے جاری رکھے ہوئے ہیں۔ اس وقت اس کا ایک اور بہروپ یہ ہے کہ ان شرنارتھیوں کو ریاست میں شہری حقوق عطا کئے جائیں جو مغربی پاکستان سے ۱۹۴۷ء میں فرار ہو کر ریاست میں آئے اور بس گئے۔

جیسا کہ آئینی اور قانونی پہلو کا تقاضہ ہے یہ لوگ ریاست جموں و کشمیر کے شہری تقسیم سے پہلے بھی نہ تھے اور ریاست کے آئین اور آئین ہند کی دفعہ ۳۷۰ کے تحت یہ ریاست کے باشندے ہرگز قرار نہیں دیئے جا سکتے یہ صحیح ہے کہ انسانی ہمدردی کے تقاضے کے طور پر ریاستی حکومت نے عارضی طور انہیں اس وقت ریاست میں رہنے کی اجازت دے دی۔ لیکن اس وقت بھی مرکزی

انسانی خونریزی کے خوفناک جھکڑ چلنے لگے۔

جموں میں اس سے پہلے ہی مشرقی پنجاب سے راشٹریہ سنگھ کے چالک اور رضاکار پہنچ کر قتل عام کر رہے تھے۔ جتھوں کے جتھے مسلح ہو کر آئے تھے اور کٹھوعہ سے لے کر ریاسی اور رام بن تک پھیل گئے تھے۔ جموں پہنچ کر "شاہی جوڑے" نے اس غارت گری کی کمان خود سنبھال لی۔ خاص طور پر مہارانی اس سلسلے میں بہت ہی سرگرم نظر آئیں۔ مہاراج کی فوج کے سپاہیوں کو بھی اشارہ مل گیا اور وہ سرکاری اسلحہ خانے سے مسلح ہو کر نکلے اور چاروں طرف موت کا بازار گرم کرنے لگے۔ نومبر ۱۹۴۷ء کے پہلے ہفتے میں جس طرح پاکستان جانے کا جھانسہ دے کر مسلمانوں کو نکالا گیا اور پھر انہیں سانبہ کے راستے میں مشین گنوں سے بھون ڈالا گیا وہ معاصر تاریخ کا دل دہلا دینے والا المیہ ہے۔ دوسری طرف پونچھ سے لے کر سانبہ تک ساری سرحد کو مسلمانوں سے خالی کرنے اور انہیں سرحد پار ہانک دینے کی کاروائی، مہاراجہ، مہاجن، تیرتھ اور راشٹریہ سنگھ کے نیتا ایک متحدہ کمان کی طرح پوری مستعدی سے انجام دیتے رہے۔ راشٹریہ سنگھ اور اس کے اتحادی مہر چند مہاجن یہ سب کچھ ایک خاص پلان کے تحت کر رہے تھے۔ اس سے پہلے پنجاب میں کپورتھلہ کی مسلم اکثریت والی ریاست سے مسلمانوں کا وجود حرف غلط کی طرح مٹا دیا گیا تھا۔ اور بھرت پور اور الور میں انہیں چن چن کر قتل کر دیا گیا تھا۔ چناں چہ شیخ محمد عبداللہ نے ۲۱ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو نئی دہلی میں ایک اخباری کانفرنس میں اس سازش کا پردہ چاک کیا اور پونچھ اور دوسرے علاقوں میں ریاستی مسلمانوں کے قتل عام پر صدائے احتجاج بلند کی۔

اُن دنوں دلّی میں مہاتما گاندھی اپنا خون پسینہ اور آنسو بہا کر نفرت کی اس آگ کے شعلے فرو کرنے میں مصروف تھے۔ نئی دہلی کے ایوان اقتدار میں اصل طاقت اُن لوگوں کے ہاتھ میں تھی جنہیں نہ مہاتما گاندھی کے آدرش وادی فائر بریگیڈ سے کوئی ہمدردی تھی اور نہ جواہر لال نہرو کی سیکولر پسندی سے دل چسپی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ جموں وکشمیر ایک ہندو اکثریتی ریاست کی حیثیت سے ہی ہندوستان کے ساتھ رہے۔

جموں کے علاوہ ریاسی، کشتواڑ، بھدرواہ، اکھنور، کٹھوعہ وغیرہ میں بھی مسلمان قتل کئے گئے اور اُن کی ہزاروں بہو بیٹیاں اغوا کر لی گئیں۔ اس زمانے میں دو لاکھ سے زیادہ مسلمان سرحد پار بھگا دیئے گئے جو پھر کبھی واپس نہ آسکے۔ اُن ہی دنوں مہر چند مہاجن نے جموں کے ہندوؤں کے ایک وفد سے بات چیت کرتے ہوئے کہا کہ وہ ریاست کی وزارت میں اپنے لئے برابر کا حصہ PARITY طلب کریں۔ جب انہوں نے کہا کہ ہماری تعداد مسلمانوں کے مقابلے میں کم ہے تو مہاجن نے کہا کہ اُس کی فکر آپ نہ کریں۔ اس کا انتظام کر لیا گیا ہے اور سب کچھ

ٹھیک ہو جائے گا۔ واقعہ یہ ہے کہ مہاجن کی ریشہ دوانیوں کی بدولت جموں کا مسلم اکثریتی صوبہ ہندو اکثریت کا صوبہ بنانے میں کامیابی حاصل کر لی گئی تھی۔ اس کے بعد جب شیخ محمد عبداللہ کی حکومت نے جموں میں قتلِ عام کو روکنے کے لئے دلّی پر زور ڈالا تو یہ بات سمجھی گئی کہ معلوم ہے کہ مہاراجہ نے اپنے ہرکارے دیہات میں بھیجے۔ جہاں جہاں وہ جا کر یہ کہہ دیتے تھے کہ اب مہاراجہ بہادر کا حکم ہے کہ قتل و غارت بند کر دیا جائے وہاں کھلے ہوئے چاقو بند اور چمکتی ہوئی تلواریں نیام میں چلی جاتی تھیں۔ اس قتل و غارت کا نتیجہ یہ ہوا کہ جموں میں مسلمانوں کی آبادی کا سارا گراف تبدیل ہو گیا۔ ۱۹۴۱ء کی مردم شماری کے مطابق جموں کے اُن علاقوں کی جو ہندوستان یونین کے پاس ہیں کی مسلمان آبادی ۶,۷۰,۰۰۰ تھی۔ ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے مطابق یہ صرف ۵,۹۹,۴۹۲ تھی۔ حالاں کہ اس دوران ریاست کی آبادی میں ۱۷ فیصدی سے زیادہ کی شرح سے اضافہ ہوتا رہا۔

۱۹۵۳ء کے نرغے کے بعد

۱۹۶۵ء کی ہند پاکستان جنگ میں کشمیر کو مسلم اقلیت کی ریاست بنانے کی کوشش پھر شروع کی گئی۔ اور اب کے اس ناپاک مہم کی کمان بیربل در اور راج کاک در کے ایک پڑپوتے ڈی۔ پی۔ در سنبھال چکے تھے۔ ڈی۔ پی۔ اُس وقت غلام محمد صادق کی حکومت میں وزیر داخلہ تھے اور اسی لئے انہوں نے سارے سرحدی علاقے کو مسلمانوں سے پاک کرنے کی ٹھان لی۔ حالانکہ خود حکومت ہند نے دراندازوں کی پہلی خبر لانے کے لئے ایک سرحدی باشندے محمد دین کو پدم شری کا خطاب دے کر ریاستی مسلمانوں کے قومی جذبے کو تسلیم کر لیا تھا۔ پونچھ علاقے سے تو اُس وقت شہری انتظامیہ کو قطعاً موقوف کر دیا گیا تھا اور ڈپٹی کمشنر کو واپس بلا لیا گیا تھا۔ وہاں کے کانگریسی ممبر پارلیمنٹ غلام محمد میر، وہاں کے ایم۔ ایل۔ اے اور ایم۔ ایل۔ سی کو بھی وہاں جانے سے روک دیا گیا اور انہیں ڈی۔ پی۔ در نے اپنے مکان میں بڑے ٹھاٹھ باٹھ سے رکھا اور عیاری کے ساتھ روک دیا۔ ڈی۔ پی۔ در کے اشارے پر راشٹریہ سویم سنگھ کے سرو سنگھ چالک گورو گولوالکر جموں آئے اور سارے علاقے سے مسلمانوں کو نکالے جانے کے لئے ڈی۔ پی۔ در اور گولوالکر میں رازدارانہ کھسر پھسر ہوتی رہی۔ چونکہ فوج سول انتظامیہ اور سیاسی مشاورت کے بغیر بالکل اجنبی بن کر رہ گئی تھی لہٰذا ضلع میں نفسا نفسی اور افراتفری کا عالم برپا ہو گیا۔ ڈی۔ پی۔ در اپنے مشن کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے خود پونچھ گیا۔ مگر اس دوران بہت سی ایجنسیوں

حکومت کے ساتھ مفاہمت یہ تھی کہ یہ مرکزی حکومت کی ذمہ داری کے زمرے میں آتے ہیں اور جونہی حالات معمول پہ آئیں انہیں ریاست سے باہر مناسب مقامات پہ آباد کر دیا جائے گا لیکن مرکزی حکومت اس سلسلے میں اپنی ذمہ داریاں نبھانے میں گریز سے کام لیتی رہی۔ شاید وہ بھی اُن عناصر کے دباؤ کے تحت چل رہی تھی جو ان شرنارتھیوں کو اس لئے ریاست میں آباد رکھنے پہ مُصر ہیں تاکہ ریاست میں آبادی کے تناسب کو ہندوؤں کے حق میں کرنے کی ابتدائی مہم ایک فیصلہ کُن منزل طے کر لیا جائے۔ ریاستی حکومت نے ان شرنارتھیوں کو زمینیں دی ہیں جنہیں وہ کاشت کر کے فصلیں حاصل کرتے ہیں۔ انہوں نے مکانات تعمیر کئے ہیں۔ انہیں روزگار کے وسائل اور تعلیم کی سہولیات فراہم ہیں۔ صرف انہیں ریاستی اسمبلی کے لئے ووٹ اور زمینوں کی ملکیت کے حقوق حاصل نہیں۔ لیکن فرقہ پرست عناصر کو انہیں آباد کرنے کے انسانی پہلو سے کم دلچسپی ہے۔ وہ تو انہیں اپنے بڑے سیاسی مقاصد کے لئے ایندھن کے طور پر استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ اور اسی لئے جموں سے لے کر دہلی تک انہیں ریاست کے حقوق عطا کرنے کا شور و غوغا کیا جاتا ہے۔

ریاست میں ریاستی حکومت کی مستعدی کے باوجود ان اقدامات نے صورت حال میں کس حد تک تبدیلی لائی ہے اُس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ جہاں ۱۹۴۱ء کی مردم شماری کے وقت ریاست میں مسلمانوں کا تناسبِ آبادی ۷۷ء۱۱ فی صدی تھا وہاں ۱۹۸۱ء کی مردم شماری کے وقت یہ تناسب ۶۵ء۸ فی صدی تک گھٹ گیا ہے۔ نسل کشی اور آبادی کا تناسب بگاڑنے والے گدھ لوہ میں ہیں اور وہ چند اور معرکے سر کر کے معاملات کو اپنی پسند کے مطابق ڈھال دینا چاہتے ہیں۔ اس تناظر میں جموں و کشمیر اسمبلی کے حالیہ ری سٹلمنٹ بل کے متعلق شور و غوغا ان کی اصل نیت اور ان کے دل کے چور کو پوری طرح بے نقاب کرتا ہے۔

پاکستان میں کشمیر کے باشندوں کی تعداد ویسے ہی کم ہے اور اُن میں سے بھی اکثر وہاں تجارت۔ نوکری۔ روزگار اور نکاح وغیرہ کے روابط میں بندھ چکے ہیں اور شاید اُن کے لئے وطن واپس آنا ممکن نہ ہو۔ گذشتہ پینتیس سال میں اس قسم کے کُل ۱۱۷ افراد کشمیر آئے۔ لیکن ہر سال گذرنے کے بعد یہاں آنے والوں کی تعداد اور کم ہوتی جا رہی ہے۔ مگر یہ بلا اُن عناصر کے اعصاب پہ سوار ہو گیا ہے جو کشمیر کے مسلمانوں کو صرف بے بسی، بے کسی اور اقلیت کی شکل میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ ایسے عناصر کی ریشہ دوانیاں آج صدیوں سے جاری ہیں۔ ذہنیت ایک ہے اگرچہ اس کے ظاہری روپ اور بھیس مختلف ہیں۔ مقصد ایک ہی ہے۔ اگرچہ اس کے لئے

استعمال کی جانے والی زبان اور اصطلاحیں مختلف ہیں لیکن ان عناصر کو آج تک کشمیری عوام کے مبنی بر انصاف، اصولوں اور آن کی ہوشیاری نے ناکام بنا دیا ہے۔ مستقل ہوشیاری اور دائمی بیداری قومی آزادی کی ہی نہیں قومی وجود کی بھی قیمت ہے۔ اگر خدانخواستہ فرقہ پرستی کی یہ زہریلی فوج کشمیریوں کو دام بلا میں لانے میں کامیاب بھی ہو گئی تب بھی خود انہیں اور ساری دنیا کو معلوم ہونا چاہیئے کہ کشمیری مسلمان انتہائی دشواریوں کے باوجود اپنے آدرش کی خاطر جیئے اور مرے اور انہوں نے فرقہ پرستی کے بھوت کے آگے سر جھکانے کی بجائے سر کٹانے کو ترجیح دی۔ کشمیری مسلمانوں نے نیک نیتی سے ہندوستان کے ساتھ الحاق کیا۔ مگر ہندو فرقہ پرستوں نے اُن کو دغا دی اور اُن کی پیٹھ میں سازش اور دشواس گھات کا خنجر گھونپ دیا۔

دوسری اقلیتوں کی رائے

ہندو فرقہ پرستی کی اس جنگ جویانہ یلغار کا خاص نشانہ اگرچہ کشمیر ہے لیکن اس خطرناک اژدہے نے اب مناسب اور سازگار فضا پا کر اپنے پھن سارے ہندوستان میں پھیلانا شروع کر دیئے ہیں۔ میزورام اور ناگالینڈ میں عیسائیوں کا صفایا کیا جا رہا ہے اور وہ چلّا رہے ہیں کہ اُن کو دوسرے درجے کے شہریوں کی حیثیت سے بھی برداشت نہیں کیا جا رہا ہے۔ ہندو انتہا پسند اب کیرالہ جیسی رواداد ریاست میں اپنی ذہنیت کا زہر گھول رہے ہیں۔ وہاں حال ہی میں منظّم ہندو جتھوں نے عیسائی گرجوں پہ حملے کر کے ہلاکت اور آتش زنی کی ہولی کھیلی۔ ہری جنوں کو تو بڑی ذات کے یہ ہندو چوپائیوں کا بھی درجہ نہیں دیتے۔ اور حال ہی میں جگ جیون رام جیسے شخص کو کہنا پڑا کہ ہندوستان کو کسی بھی بیرونی حملہ آور سے اس قدر خطرہ نہیں ہے جتنا ظالم اور جارحانہ برہمنیت سے ہے۔ سکھوں کا طبقہ ہندو فرقہ پرستی کے ہاتھوں کس طرح دار و زبوں ہے اور کیا سوچ رہا ہے اُس کے متعلق شرومنی گوردوارہ پربندھک کمیٹی میں سکھ ریسرچ بورڈ کے سربراہ سردار دیوندر سنگھ دُگل کے یہ تاثرات بے حد عبرت انگیز اور سبق آموز ہیں۔

> "ہندو لیڈروں نے ۱۹۴۷ء میں ملک کی تقسیم منظور کر کے سکھوں اور مسلمان خدائی خدمت گاروں کے ساتھ دغا کی۔ خان عبدالغفار خان اور ولی خان آج تک ہندو لیڈروں پر بھروسہ کرنے کا خمیازہ ادا کر رہے ہیں .... سکھوں کو تو جرائم پیشہ طبقے کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ ہندوستان میں

جموں وکشمیر قانون سازیہ نے اپنے پچھلے اجلاس میں اُن کشمیری باشندوں کے واپس وطن آنے کے سلسلے میں ایک بل بنایا ہے جو ۱۹۴۷ء کے بعد اپنی مرضی کے خلاف اور حالات کی سازش کے نتیجے میں وطن بدر رہنے اور وہاں مقیم ہونے پر مجبور ہوگئے ہیں۔ اگرچہ یہ بل ایک بہت ہی معصومانہ قسم کی قانون سازی کی ایک مثال ہے لیکن اِس نے ہندو فرقہ پرستوں کے دلوں کے ساتھ وہی کام کیا ہے جو بھڑوں کے چھتے کے ساتھ کوئی پتھر کرتا ہے۔ نیت میں فتور اور دل میں چور ہو تو وہ کبھی کبھی نادانستہ بلکہ غیر ضروری طور پر اپنا بدصورت سر نکالتا ہے۔ ہندو فرقہ پرستوں کے دل و دماغ سے اس وقت عداوت اور کدورت کا جو لاوا اُبل رہا ہے وہ اسی بل کی دیا سلائی لگنے کا نتیجہ ہے۔ تعصب اور تنگ نظری کا یہ دھماکہ کچھ اتنی شدت سے سامنے آیا ہے کہ دیکھنے والے سناٹے میں آگئے ہیں اور انصاف پسند ششدر رہ گئے ہیں۔ اس معصوم اور بے ضرر سے بل کی آڑ میں اِس وقت ہندو پریس اور ہر سطح اور طبقے سے تعلق رکھنے والے ہندو فرقہ پرستوں شور شرابہ کر رہے ہیں۔ کشمیر کی مسلم قیادت اور کشمیری مسلمانوں کے خلاف ہندو فرقہ پرستوں کی یہ نفرت وعداوت کوئی نئی بات نہیں ہے بلکہ ایک بڑے سلسلے کی تازہ کڑی ہے اس لئے اس کی ماہیت جاننے کے لئے ناسور کے اُن سرچشموں کی تواریخ دیکھنا ہوگی جہاں سے نفرت، عداوت، تعصب اور تنگ نظری کی یہ پیپ بہتی رہتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہندو فرقہ پرست اس روگ میں مدت سے مبتلا ہیں۔ بلکہ سچ پوچھئے تو یہ بیماری نسل در نسل منتقل ہوتی چلی آرہی ہے۔ اب تو اس کی نوعیت یہ ہے کہ یہ درد لادوا بن گئی ہے لیکن اس کی جڑیں ٹٹولنے سے پہلے اس کے تازہ کارن یعنی ری سیٹلمینٹ بل پر ایک نظر ڈالنا پڑے گی۔

بل بنانے کی وجوہات

جب ۱۹۴۷ء میں ریاست جموں کشمیر کی تحریک آزادی کے باپ اور بانی شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہؒ کی قیادت میں ریاست

نے مسلم اکثریت والے پاکستان کے مقابلے میں سیکولر اصولوں مگر ہندو اکثریت کے ملک ہندوستان سے رشتہ جوڑا تو کشمیر کے باشندوں کی بڑی تعداد پاکستان کے حصے میں آئے ہوئے علاقوں میں پھنس گئی۔ تقسیم سے پہلے ریاست کے سارے راستے ان علاقوں سے ہو کر جاتے تھے۔ جو نئی مملکت پاکستان کا حصہ بنے۔ کشمیریوں کی تجارت، پیری مریدی، رشتے ناطے وغیرہ سیالکوٹ، راولپنڈی اور لاہور کے خطوں کے ساتھ تھے۔ ثقافتی ہم آہنگی اور مذہبی یکسانیت نے بھی ان رابطوں کو گہرا کر دیا تھا۔ لیکن تقسیم، بادل پھٹنے (CLOUD BURST) کی واردات کی طرح نازل ہوگئی۔ کشمیر کے بہت سے مسلمان اپنی مرضی کے خلاف حالات کی سازش کے جال میں بند ہوگئے۔ پھر کشمیر کے معاملے پر ہندوستان اور پاکستان کے درمیان لڑائی چھڑ گئی۔ اور ان بدنصیب غریب الوطنوں کی واپسی کے تمام پُل مسدود اور تمام راستے بند ہوگئے۔

کشمیر نے سیکولر ہندوستان کے ساتھ الحاق اس لئے کیا تھا کیونکہ اُسے ضمانت دی گئی تھی کہ اس کے باشندوں کو بلا تمیز مذہب و ملت ہندوستان کا معزز شہری تسلیم کیا جائے گا۔ اس کی تحریک آزادی کے مقاصد اور اس کے باشندوں کی اُمنگوں اور آرزوؤں کو پورا ہونے کے تمام مواقع فراہم کئے جائیں گے اور یہاں کے عوام کی مخصوص دینی، تمدنی، سماجی اور سیاسی شیرازہ بندی کو برقرار رکھا جائے گا۔ چنانچہ تقسیم کا اُڑایا ہوا غبار کچھ کچھ صاف ہونے لگا تو پاکستان میں پھنسے ہوئے بدنصیب کشمیریوں کی حالت زار دلوں کو کرُیدنے لگی۔ باپ بیٹے سے جُدا ہو گیا تھا۔ ماں اولاد سے دُور ہو گئی تھی۔ جوان دُلہنیں اپنے سُہاگ سے بچھڑ گئیں تھیں۔ کنبوں کے کنبے اس عذاب میں تڑپ رہے تھے اور اُن کی دلدوز چیخیں سرحد کے آرپار جاکر دلوں میں نشتر چبھو رہی تھیں۔ اس حالت میں ۵۲ء میں کشمیر اسمبلی میں ممبران نے بڑے جذبات انگیز واقعات سُنا کر بے قصور غریب الوطنوں کو واپس کشمیر لانے پر زور دیا۔ شیخ صاحب کی حکومت ان جذبات سے پوری طرح ہمدردی رکھتی تھی۔ اور وطن کے جلاوطن بیٹے بیٹیوں کو جلد از جلد اپنے خویش واقارب کے ساتھ ملانے کے جتن کر رہی تھی۔ چنانچہ اُس نے اِس معاملے کو جواہر لال نہرو اور اُن کی حکومت کے ساتھ اُٹھایا۔

تقسیم ملک کے بعد حکومت ہند نے یہ قانون بنایا تھا کہ ہندوستان سے پاکستان ہجرت کرنے والا کوئی مُسلمان واپس ہندوستان لوٹنا چاہے تو وہ حکومتِ ہند کی اجازت سے واپس آکر اپنی شہریت پھر حاصل کر سکتا ہے۔ لیکن اس قانون کے زُمرے میں ریاستِ جموں وکشمیر نہیں آتا تھا۔ جموں وکشمیر کی ایک خصوصی حیثیت تھی۔ یہاں کی اسمبلی میں جنگ بندی پار کے عوام

کے لئے ۲۵ سیٹیں مخصوص رکھی گئی تھیں چنانچہ شیخ محمد عبداللہ کی حکومت اور مرکزی حکومت کے درمیان کشمیر کی خصوصی پوزیشن کی تصدیق و تشریح کے لئے دلی اگری مینٹ پر دستخط کئے گئے۔ اس معاہدے کے تحت قرار پایا کہ پاکستان میں جو کشمیری پھنس گئے ہیں اُن کی ہندوستانی شہریت برقرار رہے گی۔ لیکن اُن کے واپس آنے اور متعلقہ قواعد کے متعلق قانون بنانے کا اختیار جموں و کشمیر قانون سازیہ کو ہوگا۔ اسی اگری مینٹ کے تحت ۱۹۵۴ء میں ایک خاص اقدام کے ذریعے آئینِ ہند میں ترمیم کی گئی اور اس کی دفعہ ۹، کی شق ۲ کے تحت کشمیری باشندوں کی وطن واپسی اور اُن کی ہندوستانی شہریت کا حق تسلیم کیا گیا اور اس سلسلے میں ریاستی قانون سازیہ کو مناسب قانون بنانے کا اختیار تفویض کیا گیا۔ دہلی اگری مینٹ ہندوستان اور ریاست کی فرقہ پرستی کے سانڈ کے لئے ایک لال چیتھڑے کی حیثیت اختیار کر گیا اور کشمیر کی مسلّمہ قیادت کے خلاف سازشوں کا ایسا جال بُنا گیا کہ اُس میں مرکز کے بڑے بڑے جگادری پھڑ پھڑانے لگے۔ اس سے پہلے کہ ریاستی اسمبلی پاکستان میں پھنسے ہوئے کشمیریوں کی واپسی کے سلسلے میں قانون بنا لیتی ۹ اگست ۱۹۵۳ء کا زغہ پیش آیا۔ کشمیری اُمنگوں کے علمبردار شیخ محمد عبداللہ کو اسیر بنا لیا گیا۔ ساتھ ہی کشمیر کی مُستند اُمنگ اور معتبر آواز کو زنجیریں پہنا دی گئیں۔ ۱۹۵۳ء کے بعد کشمیر میں کٹھ پتلی حکومتیں ہند و فرقہ پرستوں کی خوشنودی سے زندگی کی سند حاصل کرتی تھیں اور اُن کے اشارۂ ابرو پر ناچتی تھیں۔ اس لئے اُنہوں نے کشمیری مسلمانوں کی واپسی کے قانون کو طاقِ نسیاں میں پھینک دیا۔ مگر جب ۱۹۷۷ء میں شیخ محمد عبداللہ کی تنظیم کو انتخابات میں بھاری اکثریت حاصل ہوئی تو اُنہوں نے ریاستی قوانین میں اِس کوتاہی کا مداوا کرنے کی ٹھان لی۔ دوسری طرف پاکستان سے ویزا وغیرہ پر آئے ہوئے چند کشمیری مُسلمانوں نے ہندوستانی اور ریاستی آئین کی دفعات کا سہارا لیکر عدالت کے دروازے کھٹکھٹانے شروع کر دیئے۔ عدالتوں کو بھی عجیب صُورتحال کا سامنا ہونے لگا اور قانون کی اس کمی اور کوتاہی کا ازالہ کرنے کی ضرُورت شدید اور سنگین ہو گئی۔ چنانچہ ریاست کے وزیرِ اعلیٰ شیخ محمد عبداللہ نے اس انتہائی نازک اور دردمندانہ انسانی مسئلے کو وزیرِ اعظم ہندوستان شری مرارجی ڈیسائی کے ساتھ اُٹھایا۔ اُنہیں دہلی اگری مینٹ اور کشمیری مُسلمانوں کے اُس اعتماد کی یاد دلائی جو اُنھوں نے اِلحاق کرتے وقت سیکولر ہندوستان پر کیا تھا۔ شیخ صاحب نے وزیرِ اعظم کو بتایا کہ پاکستان میں پھنسے ہوئے بڑے بوڑھے کشمیریوں کی آنکھیں اب اپنے بچھڑے ہوئے عزیزوں کے چہرے دیکھنے کیلئے پتھرا گئی ہیں۔ اُن کی نگاہیں اپنے عزیز وطن کی گلیوں کو دیکھنے کے انتظار میں بے نُور ہو گئی ہیں اور اب وہ کسی طرح اپنے زار و نزار بدنوں

کے پنجر جسموں کو کشمیر پہونچا کر مادرِ وطن کی زمین میں ابدی نیند سو جانا چاہتے ہیں۔ مائیں بیٹیوں کی شادیاں رچانا چاہتی ہیں اور شوہر اُن بوڑھی بیویوں سے ملنا چاہتے ہیں جنہیں وہ اُس وقت چھوڑ گئے تھے جب اُن کے ہاتھوں میں مہندی رچی ہوئی تھی۔ اسی دوران ۱۹۸۰ء میں راقم الحروف نے اسمبلی میں اُس قانون کا مسودہ پیش کیا جس کے تحت قانون کی کمی دور کرکے پاکستان میں پھنسے ہوئے کشمیریوں کو واپس وطن آنے کی اجازت دینا مقصود تھا۔ یہ قانون ریاست کے آئینی مرتبے اور ریاستی باشندوں کے جائز حقوق سے ہم آہنگ تھا۔ اس کے سیاسی پہلو سے قطع نظر کرکے بھی اس کی بدولت بہت سی آئینی اور قانونی اُلجھنوں کا مداوا ممکن تھا۔ ریاستی اسمبلی نے اس کو مناسب غور و خوض اور چھان پھٹک کے لئے ایک نمائندہ سلیکٹ کمیٹی کے سپرد کیا جس میں حزبِ اختلاف کے ارکان بھی شامل تھے۔ یہ ۱۹۸۱ء کا واقعہ ہے۔ اگرچہ ریاستی حکومت کیلئے کوئی آئینی یا قانونی پابندی نہیں تھی کہ وہ اس بل کے متعلق مرکز کی رائے حاصل کرے۔ لیکن چونکہ اُس کے ارادے بالکل صحیح اور صاف تھے۔ لہٰذا اُس نے مرکزی حکومت کو اعتماد میں لینے کا فیصلہ کر لیا۔ اُدھر پاکستان سے چند کشمیری مہاجرین واپس کشمیر آئے اور اُنہوں نے ملک اور ریاست کی اعلیٰ عدالتوں کے دروازے اپنے شہری حقوق حاصل کرنے کے لئے کھٹکھٹائے۔ ان مقدمات میں مرکزی اور ریاستی حکومتوں سے صفائی طلب کی گئی۔ مرکزی حکومت کے پاس عدالتوں میں اُٹھائے جانے والے جائز سوالات کا کوئی جواب نہیں تھا۔ چنانچہ حکومت جموں و کشمیر نے اس سلسلے میں مرکزی حکومت سے صلاح مشورہ کرنے کا فیصلہ کر لیا، چونکہ پاکستان میں مقیم کشمیریوں کی وطن واپسی اور اُن کے شہری حقوق کی صحیح صورتحال کے متعلق قانون کی کوتاہی کو دُور کرنے کی زبردست ضرُورت پیدا ہو گئی تھی۔ لہٰذا حکومت نے اسمبلی کے سامنے اِس بِل کے سلسلے میں مرکزی حکومت کی رائے حاصل کرنے کی طرف توجہ دی۔ اکتوبر ۱۹۸۱ء کو مرکزی وزارت داخلہ اور وزارت قانون کو اس مسودہ بِل کی کئی کاپیاں بھیج دی گئیں۔ تاکہ وہ اُس کے آئینی اور قانونی مضمرات پر غور کر سکیں اور کسی غلط اندیشی کا شکار نہ ہو جائیں۔ اس کے علاوہ عدالتوں کے سامنے متعلقہ مقدمات کے لئے مشورہ کرنے کے لئے ریاست کے لا سیکرٹری اور ایڈوکیٹ جنرل دہلی جاتے رہے۔ جہاں وہ برسبیل تذکرہ اِس بِل کے متعلق بھی مرکزی حکومت کے قانونی ماہروں سے آمنے سامنے بات چیت کرتے رہے۔ اس بات چیت کا مقصد بِل کے عندیے اور اُس کے مقاصد پر ریاستی حکومت کے خیالات پیش کرنا اور مرکزی حکومت کے قانونی ماہرین کی رائے سے استفادہ کرنا شامل تھا۔ مرکزی حکومت اس مسودے میں

کسی قسم کے نقص کی نشاندہی نہ کرسکی۔

اسی اثنا میں کوئی دو سال سے زیادہ عرصہ گذر گیا اور مسودۂ قانون مارچ ۱۹۸۰ء میں سلیکٹ کمیٹی سے واپس اسمبلی کے سامنے پہونچ گیا۔ سلیکٹ کمیٹی نے متفقہ رائے سے اس مسودے کو قانون بنانے کی سفارش کی تھی، چونکہ یہ مسودہ قانون ریاست اور مرکزی آئین کی سپرٹ سے بالکل ہم آہنگ تھا اور اس سے مروجہ قانون کی ایک بڑی خامی دور ہو جاتی تھی جو مرکزی اور ریاستی حکومتوں کے لئے الجھن بنی ہوئی تھی اور چونکہ اس سے پاکستان میں پھنسے ہوئے کشمیریوں اور انسانی مسئلہ کو حل کرنے کی صورت پیدا ہوتی تھی اس لئے ریاستی حکومت نے اس بل کی تائید کی اور اس طرح سے یہ بل اسمبلی نے اس سال کی ابتدا میں اپنے جموں کے اجلاس میں منظور کردیا۔ اس کے بعد اسے آئینی آداب کی پیروی میں ریاست کے گورنر کے دستخطوں کے لئے روانہ کردیا گیا۔

جیسا کہ ظاہر ہے یہ بل ریاستی اور مرکزی آئین کے ساتھ مکمل ہم آہنگ ہے اور مرکز اور ریاست کے مسلّمہ عہد و پیمان کا پورا لحاظ رکھ کر بنایا گیا ہے۔ اس میں کوئی آئینی یا قانونی سقم موجود نہیں۔ اسے نہ تو رازداری سے پاس کیا گیا ہے اور نہ اس میں کسی قسم کی بدنیتی کارفرما ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس کے خلاف ہندو فرقہ پرستوں نے گلا پھاڑ پھاڑ کر چلانا شروع کردیا ہے اور وہ اب شور و غوغا کے تشدد سے ریاست کے گورنر کو خوف زدہ کرنا چاہتے ہیں تاکہ وہ اپنی آئینی ذمہ داریوں کو پامال کرتے ہوئے اس بل پر دستخط نہ کریں۔ فرقہ پرست ہندو اس بل کے پاس ہونے سے عجیب ہذیانی کیفیت میں گرفتار ہو گئے ہیں وہ اسے ملک کی سلامتی کے خلاف سازش اور ریاست کی سالمیت کے خلاف چال قرار دے رہے ہیں۔ ان کے اٹھائے ہوئے نکتوں پر ایک نظر ان کی پریشان خیالی اور بے سر و پیر موقف کی نشاندہی کے لئے کافی ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ اگر بقول ان فرقہ پرستوں کے یہ بل آئین کے منافی ہے تو وہ اس کے جواز کو کیوں ملک کی سب سے بڑی عدالت سپریم کورٹ میں چیلنج نہیں کرتے۔ سپریم کورٹ ہی آئین کی تشریح و تفسیر اور اس کی حفاظت کی ذمہ دار ہے۔ اس کے برعکس گورنر آئین کا ایجنٹ ہے اور اس کے تابع اس کو چنی ہوئی اسمبلی کے بنائے فیصلے کو مسترد کرنے کا اختیار نہیں ہے وہ آئین اور منتخبہ آئینی اداروں کی منشا کے تابع ہے اور اس سے قانون سازیہ کو زوال بخشنے کی توقع نہیں رکھی جا سکتی۔ اس لئے اگر اس بل کی جوازیت کے بارے میں کسی کے دل میں کوئی شک و شبہ ہے تو اس کے لئے ملک کی سب سے بڑی عدالت کے دروازے کھلے

ہیں لیکن ان فرقہ پرست دوستوں پر سپریم کورٹ میں جانے کے خیال سے کپکپی طاری ہوتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ انہیں اپنے مقدمے کے کمزور اور اپنے دلائل کے بودا ہونے کا پورا احساس و ادراک ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ یہ بل ریاستی اسمبلی نے پاس کیا ہے جو ریاست کے عوام نے ایک نہایت ہی شدید مقابلے اور معرکہ آرائی کے بعد چنی ہے۔ یہ اسمبلی ریاستی عوام کی مرضی اور ان کے اختیار اعلیٰ کی علامت ہے۔ اس قانون پر شور و غوغا بپا کرنے والے لوگ دراصل ریاستی عوام کے فائق حق رائے دہندگی اور قانون پر چھینٹے اڑا رہے ہیں اور جمہوریت نوازی کے بدلے آمریت کے رجحان کی طرفداری کر رہے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ ریاست کی حکمران جماعت نے اسے ایک الیکشن سٹنٹ کے طور پر پاس کیا ہے تاکہ اسے مسلمانوں کے زیادہ سے زیادہ ووٹ حاصل کرنے میں کامیابی ہو۔ ذرا سے غور کے بعد اس الزام کے پھسپھسے ہونے کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ یہ بات کسی سے پوشیدہ نہیں کہ شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ کو جموں و کشمیر کے مسلمانوں کا بھرپور اعتماد حاصل ہے۔ یہ صداقت اتنی بار ثابت کی جا چکی ہے کہ اب اس کے لئے مزید شہادت کی ضرورت نہیں۔ اس لئے مسلمانوں کو اپنی خوشنودی کے دائرے میں لانے کے لئے وہ ایسے جتن کرنے کے حاجت مند نہیں۔ ہاں جموں کے غیر مسلم حضرات عام طور نیشنل کانفرنس کی مخالف جماعتوں کی طرف دیکھتے رہتے ہیں اور وہ اپنے زیادہ ووٹ انہی جماعتوں کے سپرد کرتے ہیں۔ منطقی استدلال کے مطابق شیخ محمد عبداللہ اور نیشنل کانفرنس کو غیر مسلم حضرات کے ووٹ زیادہ سے زیادہ تعداد میں حاصل کرنے کی سبیل ڈھونڈنی چاہئے۔ لہٰذا اگر انتخابات کے لئے ووٹ حاصل کرنا شیخ صاحب کا مقصد ہے تو یہ بل کوئی مقصد حاصل نہیں کرسکتا کیونکہ غیر مسلم حضرات کے دلوں میں اس کے متعلق کچھ اندیشے موجود ہیں اور کچھ خدشات کو پیدا کیا جا رہا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس بل کے متعلق قسم قسم کے وسوسے پیدا کرکے فرقہ پرست ہندو جموں کے غیر مسلم حضرات کو خواہ مخواہ تذبذب میں ڈالنا چاہتے ہیں اور اس کا مقصد یہ ہے کہ ان کی صائب رائے کو جذبات کی آندھی سے مغلوب کرکے اپنی لٹی ہوئی ساکھ کو بحال کریں۔ اور اسے ایک انتخابی سٹنٹ بنا کر اپنی بے مقصد جماعتوں کے لئے ووٹوں کی بھیک مانگ سکیں۔

تصادم اور ٹکر کی اصل وجوہات

یہ تو معاملے کا آئینی اور قانونی تناظر تھا۔ اس سے صورتحال کی یک رُخی اور نامکمل تصویر سامنے آتی ہے۔ معاملے
اس کے صحیح تناسب اور تناظر میں دیکھنے کے لئے اس کے سیاسی اور تواریخی پہلو پر نظر ڈالنا لازمی ہے۔ اصل بات یہ
ہے کہ یہ ہندوستان کی سیکولر اور فرقہ پرست قوتوں کی پُرانی اور مسلسل آویزش کا ایک تازہ روپ ہے اور بس۔ اس پل کو آڑ
ماکر جو لوگ شکار کھیلنا چاہتے ہیں اُن کا ہندوستان کی سیکولر قوتوں سے کوئی علاقہ نہیں بلکہ ان کو وہی تاریک اور فرقہ پرست
تیں اُچھال رہی ہیں، جنھوں نے مہاتما گاندھی جیسے عظیم ہندوستانی کے پاک خون سے ہاتھ رنگے، جنھوں نے ہندوستان کے
سیکولر آئین کو بار بار سرِعام جلا دیا اور جو کشمیر کی مسلم اکثریت والی ریاست کی آبادی کا تناسب تبدیل کرکے یہاں کے مسلمانوں
ایک بے بس اور لاچار اقلیت میں تبدیل کرنا چاہتی ہیں۔ تواریخ کے صفحات گواہ ہیں کہ کشمیر کو مسلمانوں سے خالی کرنے اور
شمیر میں آبادی کے توازن کو بگاڑنے کے لئے بار بار مجرمانہ سازشیں کی گئیں۔ کشمیر کا مسلمان بڑا سخت جان ہے کہ ان خطرناک
ازشوں کے باوجود وہ کسی نہ کسی طرح اپنی مجروح شخصیت اور شناخت کو لئے لنگڑاتے ہوئے چل رہا ہے لیکن ہندو فرقہ
ستوں کو اُس کا یہ زخمی وجود بھی ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ وہ جلد از جلد اپنے پُرانے منصوبوں کو پورا کرکے اپنی آنکھ کا یہ ناسور دُور کرنا
اہتے ہیں اور کشمیر کو مسلمانوں کے وجود سے پاک کرنا چاہتے ہیں۔ اس سلسلے میں اُن کی حکمت عملی ایک ترشول کی تین نوکیں
ھتی ہے جس کی تشریح کشمیری محاورے میں یوں کی جاسکتی ہے۔

"ژلِن، گلِن یا ڑلِن"

(یہ یا تو بھاگ جائیں یا ختم ہو جائیں ورنہ اپنا وجود کھو کر ضم ہو جائیں)

معاملے کا تشویشناک پہلو یہ ہے کہ ان کوششوں کا ترک ہونا تو درکنار ان میں ایک نئی تیزی، تلخی اور تمازت
ئی ہے۔ یہ منصوبے اب اپنا حال اور حلیہ بدلا کر کچھ اور زہر افشانی اور قہرسامانی کے ساتھ جاری ہیں۔ پُرانے شکاری
ئے جال پھینک رہے ہیں ان کی اب بھی یہی تمنا ہے کہ کشمیر کی آبادی کے موجودہ تناسب کو ہمیشہ کے لئے بگاڑ کر یہاں

کے مسلمانوں کو ایک ایسی اقلیت میں تبدیل کر دیا جائے، جو ان نئے نوآبادکاروں کے لئے خانساماؤں اور نوکروں
چاکروں کے علاوہ کوئی اور حیثیت نہ رکھ سکیں۔ تازہ واقعات نے کشمیریوں کے سروں پر منڈلانے والے ان منحوس
خطرات کی شدت اور سنگینی کچھ اور بڑھا دی ہے۔ اور اسی لئے کشمیریوں کے لئے اس بات کی ضرورت پیدا ہو گئی
ہے کہ وہ صورتحال کا صحیح تجزیہ کریں۔ شکست و فتح تو نصیبوں کی بات ہوتی ہے لیکن مقابلہ اور مجادلہ ایمان و عاقبت
کی شرط ہوتی ہے۔ اس سے بھی بڑی بات ہے کہ صورتحال کا صحیح شعور اور اس کی دُرست آگہی سے اپنے آپ کو ہر صورت
میں لیس اور آراستہ رکھا جائے۔ کیوں کہ خدانخواستہ اگر فنا کے گرداب میں ڈوب ہی جانا پڑے تو بھی کم سے کم دمِ نزع
خُدا کا نام تو زبان پر جاری رہے گا۔ اس لئے تواریخ کے کچھ صفحات کو اس آئینے میں منعکس کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی ہے۔
اس کے سرنامے کے لئے علامہ اقبالؒ کے اس شعر سے موزوں اور کونسی بات ہو سکتی ہے۔

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سُراغِ زندگی
تو اگر بنتا نہیں میرا نہ بن، اپنا تو بن !

کشمیر کشمیریوں کے لئے

کشمیر اس کے باشندوں کو ہمیشہ عزیز رہا ہے۔ اسی لئے وہ ستم ہائے روزگار اور جفاہائے بے شمار برداشت
کرنے کے باوجود اس کی شفیق آغوش سے جُدا ہونا پسند نہیں کرتے۔ انگلینڈ کی ایک فرانسیسی نژاد ملکہ نے کہا تھا اگر میرے
مرنے کے بعد میرے دل کو چیر کر کھولا جائے تو اُس میں فرانس کے شہر "کیلے" کا لفظ کھدا ہوا نظر آئے گا۔ ہر کشمیری کے دل میں بھی
موت کے وقت کشمیر کی شفیق اور شیتل کوکھ میں سما جانے کا خیال موجزن رہتا ہے۔ یقین نہ ہو تو مظفر آباد،
راولپنڈی اور لاہور کے کشمیری قبرستانوں کا ماجرا سنیئے جہاں اکثر قبریں زبانِ حال سے اپنے
بطن میں چھپائے ہوئے فرزندانِ کشمیر کا نوحہ بیان کرتی ہیں۔ یہ اموات وہاں امانت کے طور پر دفن

کی گئی ہیں۔ کیوں کہ مرنے کے وقت اُن خفتگانِ خاک نے وصیتیں کر رکھی ہیں کہ اُنھیں عارضی طور
پر دفن کیا جائے اور جونہی حالات اجازت دیں اُنہیں مادرِ کشمیر کی مٹی کا کفن پہنا دیا جائے، کیوں کہ
اُن کی آسودگی کی صورت صرف یہی ہے۔ ان میں میرواعظ محمد یوسف شاہ بھی ہیں اور میر مقبول گیلانی بھی،
خواجہ غلام نبی گلکار انور بھی ہیں اور محمد یوسف قریشی بھی۔ یہ کشمیریوں کی کوئی تازہ جذباتی کیفیت نہیں ہے
بلکہ اس کا اظہار آج سے ایک ہزار سال پہلے عظیم کشمیری نژاد شاعر بلہن نے اپنی سنسکرت نظموں میں بھی کیا۔ یہ
شخص کشمیر سے دکن پہونچا اور وہاں کے سمراٹ کا ملک الشعراء بن گیا۔ لیکن وہاں بھی اُسے کھنموہ گاؤں کے، جہاں
کا یہ رہنے والا تھا، زعفران زاروں اور ہرے بھرے جھنڈوں کی یاد آئی اور وہ آہ بھر کر کشمیر واپسی کی دعا مانگتا
رہا۔ کشمیر کے عظیم سلطان زین العابدین بڈشاہ اپنے ہموطنوں کی اِس حالتِ زار اور اُن کے دلی جذبات کا نبض
شناس تھا، چناں چہ اُس نے اپنے دورِ حکومت میں اُن کشمیری برہمنوں کو واپس وطن بلانے کے لئے سفارتیں
کرناٹک اور بنگال تک بھیجیں، جو اِس سے پہلے کے چند حادثات سے ناراض ہو کر کشمیر سے روٹھ گئے تھے۔
زین العابدین نے ان پنڈتوں کو محبت اور شفقت سے واپس بلایا اور جب وہ یہاں واپس پہونچے تو اُن کی
خوب آؤبھگت اور خاطر مدارت کرکے انہیں عزت و انعام سے مالا مال کر دیا۔ اُس نے اپنے اس
اِنسانیت نواز اقدام سے آنے والی نسلوں کے لئے یہ پیغام گویا نور کے حروف میں رقم کر دیا کہ
کشمیر کشمیریوں کا ہے اور کشمیر کے سپوت نہ اس خاک سے جدا کئے جا سکتے ہیں اور نہ وہ اپنی مادرِ
وطن کے خیال سے غافل بنائے جا سکتے ہیں۔

سازشوں کے غول بیابانی

کشمیر میں غیر ملکی تسلط کے ساتھ ہی غلامی کی ایک لمبی اور تیرہ و تار شب شروع ہوئی غلامی

کے ان کٹھن اور کڑے کوسوں میں کس طرح کشمیریوں کی شناخت اور اُن کے تشخص
(IDENTITY) کو پامال اور ملیامیٹ کرنے کی کوششیں ہوئیں۔ اُن کی تفصیل بڑی حوصلہ
فرسا اور طوالت طلب ہے۔ اس وقت ہم اختصار کے تقاضے کے تحت ۱۸۴۶ء
کے بعد کے چند واقعات کی طرف اشارے کریں گے۔ گلاب سنگھ نے دُنیا کی
تواریخ کا ایک عجیب و غریب اقدام کرکے کشمیریوں کو ایک بکری پتر کے ذریعہ
خرید لیا، تو اس کے ساتھ ہی کشمیر میں آبادی کے تناسب کو تبدیل کرنے کے اِنسانیت
سوز جرائم کا آغاز ہو گیا۔ گلاب سنگھ انگریزوں سے گٹھ جوڑ کرکے کشمیر حاصل کرنے میں کامیاب
ہو گیا تھا۔ اُس کی ابتدائی آمد کا کشمیری عوام نے ڈٹ کر مقابلہ کر دیا اور اُس کے
کمانڈر وزیر لکھپت کو میدانِ مائیسمہ میں ڈھیر کر دیا، جہاں اُس کی سمادھی آج بھی اُس
کی پہلی شکست کی گواہ بن کر موجود ہے۔ بعد میں انگریزوں کی سامراجی فوجوں نے کشمیر
پر چڑھائی کرکے کشمیریوں کی نکیل گلاب سنگھ کے ہاتھوں میں تھما دی۔ گلاب سنگھ کو یقین
تھا کہ کشمیر میں وہ غاصب بن کر آیا ہے اور کشمیری اُس کی اطاعت زیادہ دیر تک برداشت
نہ کریں گے۔ چناں چہ اُس نے اپنی گدی کو محفوظ رکھنے کی سبیل اسی میں دیکھی کہ کشمیر
میں آبادی کا تناسب تبدیل کرکے یہاں کے مسلمانوں کو بے بس اقلیت میں تبدیل کر دیا جائے۔
اِس اقدام کی پہلی صورت یہ تھی کہ مسلمانوں کی نسل کشی کا سلسلہ شروع کر دیا جائے۔ چناں چہ اس
دور میں کشمیری مسلمان کا لہو اتنا ارزاں تھا کہ اُس کو اگر کوئی غیر مقامی باشندہ قتل کر دیتا تو اُسے صرف چند روپے
ادا کرنا پڑتے اور معاملہ ختم ہو جاتا۔

گلاب سنگھ کو اگرچہ حکومت کرنے کیلئے زیادہ وقت نہیں ملا لیکن اُس نے اس مختصر عرصے میں
کشمیر کی مسلم اکثریت کی نسل کشی کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی۔ اُس کے زمانے میں آنے والے

بیرونی سیاحوں کا کہنا ہے کہ اُن دنوں زمینہ کدل پر ہر وقت کشمیری مسلمانوں کی لاشیں کھمبوں اور رسیوں سے آویزاں نظر آتیں تاکہ دوسرے سرکش عبرت حاصل کریں۔ اسی دوران قحط سالی کا ایک سفاکانہ علاج یہ نکالا گیا کہ مسلمانوں کو کشتیوں میں لاد کر ڈل اور وُلر جھیلوں میں غرق کیا جاتا۔ تاکہ نہ رہے بانس اور نہ بجے بانسری، جب گلاب سنگھ نے اپنے مہاراج کمار رنبیر سنگھ کی نظروں کے سامنے ایک مسلم حریت پسند کی کھال کھینچوادی تو نوجوان شہزادہ اس منظر کی تاب نہ لاسکا۔ اُس نے نظریں دوسری طرف پھیر لیں اس پر گلاب سنگھ نے سرِ عام اُسے تھپڑ مارا اور کہا کہ اُسے ایسے مناظر کو دیکھنے کی عادت ڈالنی چاہیئے کیونکہ اُسے آئندہ اس قسم کے اقدام بار بار کرنا پڑیں گے۔ گلاب سنگھ کے وقت میں بیگار کا جو سفاکانہ سلسلہ شروع کیا گیا۔ اُس کا نشانہ کلیتاً کشمیری مسلمان تھے، گلاب سنگھ کی فوج کے لئے بار برداری کے جانوروں کے طور پر صرف کشمیری مسلمانوں کو استعمال کیا جاتا۔ پنڈتوں کو اس لئے مستثنےٰ رکھا گیا تھا کہ وہ برہمن تھے اور اُن سے کوئی خدمت "دھرم راج" کے لئے جائز نہیں تھی اس دور میں مسلمانوں کے گاؤں کے گاؤں اُجڑ گئے کیونکہ مسلمانوں کے تن درست اور کمائی کرنے والے افرادِ کنبہ کو پونچھ اور گلگت کے پہاڑوں پر بیگار کیلئے بندھوا مزدوروں (BONDED LABOURERS) کے طور پر لیا جاتا تھا۔ اس رونگٹے کھڑے کر دینے والی صورتِ حال کا نقشہ ۵۳-۱۹۵۲ء میں ایک انگریز ڈاکٹر تھامپسن نے یوں کھینچا ہے۔

"گنڈ کے بعد وادی سندھ اُجاڑ اور غیر آباد ہے سنسان گاؤں اور اُن میں اُجاڑ کھیت اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ آبادی تیزی سے گھٹ رہی ہے جب ہم ذرا پہلے کے سیاحوں کا لکھا ہوا حال پڑھتے ہیں اور اُس کا مقابلہ آج کے حالات سے کرتے ہیں تو صاف نظر آتا ہے کہ مغل بادشاہوں کے وقت کے مقابلے میں آج یہاں دلدوز ویرانی آگئی ہے"

گلاب سنگھ کے زرخیز دماغ نے آبادی کا تناسب بدلنے کی ایک اور تدبیر یہ سوچی کہ کشمیر کو آہستہ آہستہ ایک نو آبادی میں تبدیل کر دیا جائے۔ ایک طرف تو اس کے باشندوں کو ہلاک کر دیا جائے یا بیگار کے ذریعے وادی سے باہر نکال دیا جائے اور دوسری طرف اپنے وفاداروں اور رشتہ داروں کی چھوٹی چھوٹی آبادیاں کشمیر کے طول و عرض میں آرے (SAW) کے تیز دانتوں کی طرح گاڑ دی جائیں، چنانچہ اُس نے جموں کے میاں راجپوتوں کی کشمیر میں بستیاں قائم کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ میاں راجپوتوں کو لا کر انہیں بڑی بڑی جاگیریں عطا کی گئیں اور انہیں بیچارے کشمیریوں کی جائیداد، زمینوں، عزت

اولاد اور مال مویشی پر اختیارات و تصرفات عطا کئے گئے۔ بعد میں ان نو آبادیوں کا حلقہ چیچک کی لڑیوں کی طرح پھیل گیا اور آج بھی سید پورہ شوپیان اور سنگھ پورہ سونا واری وغیرہ میں ان کی بقایات موجود ہیں۔ لیکن یہ بیل پوری طرح سے اس لئے منڈھے نہ چڑھ سکی، کیونکہ جو مداوا یہ لبس اور جکڑے ہوئے کشمیری نہ کر سکے وہ کشمیر کے قیامت خیز جاڑے نے کر دکھایا، جاڑے کی سختیوں کی ان دھوپ کے ماتوں کو عادت نہ تھی، لہٰذا سرما میں اُن کے ہاتھ پاؤں سوجنے لگے اور اُن کے سینے کی دھونکنی بجانے لگے چنانچہ جب کچھ اموات بھی ہونے لگیں تو یہ مقدر کے سکندر اپنی جاگیریں چھوڑ کر بھاگنے لگے اس طرح سے کشمیر کا جاڑا بھی اس بلائے درماں کے لئے ایسا ہی ثابت ہوا جیسا نپولین اور ہٹلر کے نو آبادکاروں کیلئے روس کا سرما، ہرگوپال کول خستہ نے لکھا ہے کہ میاں راجپوتوں کو تو کشمیری (مسلمانوں) کو قتل کرنے کی بھی آزادی تھی اور اُن سے باز پرس نہ ہو سکتی تھی، میاں راجپوتوں پر کسی قسم کے قانون کی پابندی لازمی نہ تھی، گلاب سنگھ کی موت بھی کشمیریوں کیلئے اُس کی زندگی کی ہی طرح جان کا وبال ثابت ہوئی۔ اُس کی موت کے بعد اس کے جانشین رنبیر سنگھ کو پنڈتوں نے بتا دیا کہ اس کے باپ کی آتما مچھلی میں داخل ہو کر آواگوان کے چکر میں پھنس گئی ہے چنانچہ کشمیر میں مچھلیوں کا شکار ممنوع قرار دیا گیا۔ یہ مصیبت ۱۸۶۷ء کے قحط میں انتہا کو پہنچ گئی۔ قسمت کا مارا کوئی کشمیری اپنے پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے کسی ندی نالے کا رُخ کر کے مچھلی پکڑ لیتا تو سرکار والا مدار کے کارندے اُس کو اس بے ادبی کا مزا چکھا دیتے۔ اُس وقت کے ایک معاصر اخبار انڈین پبلک اوپنین نے اس سلسلے میں مندرجہ ذیل واقعہ شائع کیا۔

"ایک انگریز آفیسر دریائے جہلم میں کشتی پر سیر کر رہا تھا۔ قحط کے دن تھے اُس نے کیا دیکھا کہ دریا کے کنارے ایک ویران جگہ پر تین کشمیری زنجیروں سے بندھے ہیں۔ ان کے جسم نیم برہنہ تھے اُن کے گلے میں سڑی ہوئی مچھلیوں کی مالائیں آویزاں تھیں اُنہیں تین دن اور تین رات ان سڑی ہوئی بدبودار اور عفونت آمیز مچھلیوں کی سڑاند سونگھنے اور تڑپنے کیلئے چھوڑ دیا گیا ہے۔ نہ انہیں دانہ دیا جاتا ہے اور نہ پانی ــــ ان کا قصور محض یہ تھا کہ انہوں نے پیٹ کی آگ بجھانے کیلئے مچھلی پکڑ کر اُسے نوالہ بنانے کا قدم اُٹھایا۔ کشمیر میں اب صرف مچھلی ہی نہیں بلکہ ہر قسم کا گوشت اور مرغے وغیرہ بھی حرام کر دیئے گئے ہیں۔"

رنبیر سنگھ قحط اور کالرا سے مرنے والے لوگوں کی مصیبت سے بھی پیسے بٹورتا تھا۔ انہیں کوئی رعایت دینا تو بہت دور کی بات رہی۔ اگر اُس کے احکام سے کوئی سرتابی کرتا تو اُس کی کھال ادھیڑ دی جاتی۔ کشمیریوں کی لوک روایت نے اُن ہی حالات کی عکاسی اس محاورے میں کی: "بتہ بتہ تہ پیادہ پتہ" یعنی یہاں تو روٹی کے لالے پڑے ہیں اور وہاں سرکاری ہرکارے جان کے پیچھے پڑے ہیں۔ سنہ ۱۸۶۷ء میں قحط کے ساتھ جو وبا اُٹھی اُس کا ذکر سرینگر کا ایک مشنری ڈاکٹر ٹولیف کرتا ہے:۔

"جب کالرا سے گھروں کے گھر اُجڑ رہے تھے تو شہر میں ڈھنڈورا پٹوایا گیا کہ مہاراجہ بہادر نے بیماری کا ایک حاذق علاج دریافت کیا ہے۔ یہ علاج کیا تھا؟ ایک چھپا ہوا منتر جس کی قیمت چار آنے فی تعویذ رکھی گئی تھی اگر کوئی شخص یہ خریدنے میں تامل کرتا تو اُس کے گھر کے دروازے پر چسپاں کر کے اُس سے چار آنے وصول کر لیے جاتے۔"

اتنا ہی نہیں ایک طرف قحط آبادی کا صفایا کر رہا تھا اور دوسری طرف مہاراجہ اس مصیبت کا استحصال کر کے پیسے بٹور رہا تھا۔ فرانسس ینگ ہسبنڈ کے مطابق، ۱۸۷۷ء کے قحط میں کشمیر کی آبادی کا ۲/۵ حصہ مر گیا۔ اسی قحط کو کشمیر میں آج تک "بوڈ دراگ" کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ اس قحط کے متعلق ڈاکٹر آرتھر نیو کا بیان ہے کہ سینکڑوں کشمیریوں کو دریائے وُلر میں پھینک دیا گیا۔ مسز جے۔ سی۔ مرے انسلے نے، جو اُن دنوں یہاں تھیں، ۱۳ اگست سنہ ۱۸۷۷ء کی ایک اخباری رپورٹ کے حوالے سے لکھا ہے کہ گلمرگ پہاڑ کے دامن میں ایک پورے گاؤں کے باشندوں کی ہڈیوں کے ڈھانچے برآمد ہوئے جو وہاں مہاراجہ کے سپاہیوں کے ڈر سے چھپنے کے لئے آئے تھے۔ اس قحط میں ہزاروں مسلمان وادی سے بھاگ کر پنجاب میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے ــــــ رنبیر سنگھ کے وقت میں کشمیر کی حالت کا اندازہ ایک انگریز آزادی پسند رابرٹ تھارپ کے اس اقتباس سے ہو گا:۔

"مہاراجہ اور اُس کے سپاہی کشمیریوں کو اپنا غلام تصور کرتے ہیں اور اُن پر رونگھٹے کھڑے کر دینے والے مظالم ڈھائے جاتے ہیں۔ مہاراجہ اور اُس کے کارندوں نے کشمیری مسلمانوں کو نوکروں، چاکروں، قلیوں اور خدمت گاروں کی حیثیت سے طلب کرنے کو قانونی حیثیت دی ہے اور اس قانون کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔ عجیب بات ہے کہ کشمیری پنڈتوں کو بیگار کے دائرے

میں لانا ممنوع ہے کیونکہ وہ برہمن دیوتا ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ کشمیر میں افریقہ کا نظام غلامی اپنی بدترین شکل میں موجود ہے۔"

اس سلسلے میں "ٹائمز" لندن کے نمائندے کیپٹن نائٹ نے اپنی کتاب "جہاں تین سلطنتیں ملتی ہیں" میں کشمیریوں کی حالتِ زار کا دل ہلا دینے والا نقشہ کھینچا ہے،

"بیگار اور گلگت کشمیر میں لرزہ خیز الفاظ ہیں۔ بے بس و لاچار کشمیریوں کو، جن کے بدن پر کپڑا اور پاؤں میں جوتے نہیں ہوتے، زبردستی گھروں سے گھسیٹ کر گلگت کی طرف باربرداری کے جانوروں کی طرح بھیجا جاتا ہے اور وہ اُس سنگلاخ پہاڑی راستے پر بھوک اور بیماریوں سے سر ٹکرا ٹکرا کر مر جاتے ہیں۔ برفانی دروں پر وہ طوفان کی وجہ سے اکٹھے سینکڑوں کی تعداد میں لقمۂ اجل بن جاتے ہیں۔ جب کسی آفت کے مارے کشمیری کو بیگار کے لئے پکڑ لیا جاتا ہے تو اُس کے بیوی اور بچے اُس کو گھیرے میں لے کر دل دوز انداز سے کراہتے اور بین کرتے ہیں۔ کیونکہ اُنہیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ گھر کے کمانے والے کو موت کے حوالے کر رہے ہیں اور اب کبھی اس کا مُنہ نہ دیکھ سکیں گے۔ اس قسم کے جگر خراش منظر صرف سائبیریا کے برفانی راستوں پر دیکھنے کو ملتے ہیں، مگر جہاں سائبیریا میں یہ عذاب سہنے والے مُسلّمہ مجرم اور بدمعاش ہوتے ہیں۔ وہاں گلگت کی سڑکوں پر چلنے والے کشمیری مسلمان ہیں۔ جو مہاراجہ کی بے ضرر اور بھولی بھالی رعایا ہیں۔"

رنبیر سنگھ نے کشمیر میں نو آبادکاری کی پرانی سکیم کو ایک نئی شکل دی۔ اُس نے مہاراجگنج اور مہاراجا بازار لبسائے اور ریاست کے باہر کے ہندو ساہوکاروں اور کھتریوں کو وہاں دکانیں دیں۔ اِن کھتریوں کو لانے کا مقصد دہرا تھا، ایک تو وادی کی مسلمان آبادی کا توازن بگاڑنے کا سلسلہ قائم رہے، دوسرے کشمیری اقتصادیات کی شاہ رگ اِن غیر کشمیریوں کے ہاتھ میں تھما دی جائے تاکہ وہ کشمیریوں کی رگوں میں بچے ہوئے خون کے آخری قطرے بھی نچوڑ لیں۔ اِن تاجروں کے لئے گھر مل باغ، وزیر باغ، راجہ باغ اور منشی باغ کی خاص بستیاں آباد کی گئیں جہاں انہیں نہ صرف رہائشی مقاصد کے لئے بڑے بڑے قطعہ ہائے زمین مٹی کے مول عطا کئے گئے بلکہ انہیں مکانات تعمیر کرنے کے لئے جنگل کاٹنے کی بھی اجازت دی گئی۔

یہ کشمیر میں نو آبادکاروں کے سب سے بڑے مقامی ایجنٹ ــــــ درخاندان کے عروج کا زمانہ تھا جنہوں نے کشمیریوں کی حالت پتلی بنانے کے لئے ہر ممکن تدابیر کیں اور کشمیر میں یہ محاورہ مشہور ہو گیا۔ "در آباد، کشیر برباد"۔ اسی زمانے میں ڈاکٹر

میں عہدِ حاضر کی پہلی مزدور بغاوت ہوئی جب بیچارے بے بس شال بافوں کو داغِ شال کے داروغہ راج کاک در نے رسالہ فوج کی سموں سے کچلوا ڈالا۔ اور درجنوں شال باف حاجی راتھر کی سُم سے گِر کر جہلم میں ڈوب گئے۔ ڈوگرہ شاہی کی نام نہاد دھرم پرستی پر بھی کسی کشمیری شاعر نے یوں طنز کیا ع

"بود در زبانِ اہلِ جہاں راج،
دھرم کا راج ملک کا تاراج"

اُنہی دنوں کی بات ہے کہ آریہ سماج کے بانی سوامی دیانند سرسوتی نے مہاراجہ کو مشورہ دیا کہ اس ملک کو آریہ ورت کا ملک بنانا چاہیے۔ یہاں شُدھی اور سنگٹھن کا اصول زیرِ کار لانا چاہیے۔ اور اس کو پوتر بنایا جانا چاہیے اور نیز مسلمانوں کو راج پاٹھ سے الگ رکھنا چاہیے۔"

مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے متعلق سبھی کو معلوم ہے کہ وہ صبح سے دوپہر تک، جو عام طور پر اُن کی پوجا کا وقت ہوتا تھا، کسی مسلمان کی صورت دیکھنے کے روادار نہیں تھے، بلکہ اگر غلطی سے کسی مسلمان پر اُن کی نظر پڑتی تو وہ اسے منحوس خیال کر کے اس کا کفارہ ادا کرتے۔ اُن کے زمانے میں کشمیر میں غیر مقامی ہندوؤں کی یلغار شروع ہوگئی۔ مہاراجہ کے کان میں سوامی دیانند کے لفظ گونج رہے تھے اس لئے وہ غیر مقامی ہندوؤں کو دھڑا دھڑ ریاست میں درآمد کر کے انہیں اونچے عہدوں پر فائز کرتے تھے۔ انہیں کشمیر میں رہائش اختیار کرنے کے لئے طرح طرح کی ترغیبات اور تحریصات پیش کرتے۔ غیر مقامی ہندوؤں کی یہ یلغار ایک یورش اختیار کرنے لگی۔ اُنہوں نے اپنی بہتر مہارت اور تجربے کی بناء پر ریاست کی معاشی زندگی پر اس قدر غلبہ حاصل کر لیا کہ سرکاری دفاتر پر چھا جانے کے ساتھ ساتھ جاگیروں اور تجارت میں بھی پر پُرزے نکالنے شروع کئے۔ کشمیری مسلمان تو کسی شمار و قطار میں نہ تھا۔ وہ مقابلے سے باہر ہی نہیں تھا بلکہ مقامی اور غیر مقامی دونوں برادرانِ وطن کا بے بس اور بے زبان غلام تھا جس کے خونِ پسینے سے اُن کے کھیت لہلاتے اور اُن کے عشرت کدے جگمگاتے تھے۔ لیکن جب کشمیری پنڈتوں اور جموں کے ہندو حضرات نے باہر سے آنے والوں کی چڑھائی دیکھی تو اُن کو اپنے مفاداتِ خصوصی خطرے میں نظر آئے، چنانچہ ان غیر مقامی باشندوں کو کشمیر میں جائیداد خریدنے کی اجازت نہ دینے اور ملازمتوں سے خارج کرنے کی آواز بیک وقت کشمیری پنڈتوں اور جموں کے ہندوؤں نے ۱۹۲۲ء کے لگ بھگ بلند کی۔ راجہ ہری سنگھ اُن

دنوں اپنے بوڑھے چچا مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے خلاف سازشوں میں مصروف تھا کیونکہ اپنے نرگباش باپ اور خود اپنی ریشہ دوانیوں کے پیشِ نظر اُسے خدشہ تھا کہ مہاراجہ مرتے مرتے کہیں اُسے راج تلک بخشنے سے انکار نہ کر دے۔ چنانچہ وہ بھی اس جذبے کے ساتھ مل گیا اور اس طرح سے دو شکاریوں کے درمیان ٹھن گئی۔ آخر کار کشمیر میں سٹیٹ سبجیکٹ کا قانون بنا دیا گیا جس کے تحت غیر مقامی لوگوں کے لئے کشمیر میں جائیداد کی خرید ممنوع قرار دی گئی۔ اس وقت کشمیر میں پچاسی فیصد جاگیریں جموں کے ڈوگروں اور پنڈت جاگیرداروں اور چکداروں کے پاس تھیں۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ جب مسلمان اپنی جائیداد کو نیلام کرنے کے حاجت مند نہیں رہے ہیں۔ تو آج ہری سنگھ کے لائق فرزند کرن سنگھ اسی قانون کی سپرٹ کے مطابق ترتیب دی گئی آئینِ ہند کی دفعہ ۳۷۰ کی منسوخی کا مطالبہ گلا پھاڑ پھاڑ کر کر رہے ہیں اور مقامِ عبرت ہے کہ ہمارے کچھ کشمیری پنڈت برادران جنہوں نے ایک وقت اس قانون کے نفاذ کیلئے آواز بلند کی تھی۔ آج کرن سنگھ اور غیر مقامی ساہوکار ہندوؤں کی ہاں میں ہاں ملانے میں کوئی قباحت نہیں دیکھتے، تا کہ کشمیر کی زمینیں کسی طرح غریب کشمیری مسلمانوں کے ہاتھ سے نکال کر ہندو سرمایہ داروں کے پاس چلی جانے کی سبیل پیدا ہو اور وہ دھڑا دھڑ یہاں آباد ہو کر کشمیر کے مسلمانوں کو اقلیت بنا دیں۔

کشمیر کی تحریکِ آزادی کے خلاف ریشہ دوانیاں!

پرتاپ سنگھ کے انتقال کے بعد مہاراجہ ہری سنگھ نے گدی سنبھالی تو مسلمانوں کی اکثریت کو اقلیت میں تبدیل کرنے کا جذبہ پھر زندہ ہو گیا۔ چنانچہ اس زمانے کے ہندو اخبارات کے مندرجہ ذیل تراشوں سے عیاں ہوگا کہ اُس وقت کس قسم کی کھیر پکائی جا رہی تھی۔

"ہم بھی ایک نیا گُل کھلائیں گے اور اس گُل کی مہک کابل سے کلکتہ اور کشمیر سے راس کماری تک پھیل جائے گی۔ یہ گُل ہندو سنگھٹن ہے۔ اس سے ہندو ریاست قائم ہوگی۔ پورن شدھی ہوگی اور افغانستان کی سرحد فتح ہوگی۔ یہ سب معجزے اور کرامات جلد ظہور میں آئیں گے۔"

"ملاپ" لاہور۔ ۱۵ مئی سن ۱۹۲۵ء

"جب ہندو سنگھٹن کی طاقت سے سوراجیہ لینے کا وقت قریب آئے گا۔ اُس وقت ہندو مہاسبھا اپنے

فیصلے کا اعلان کرے گی کہ نئی ہندو ریاست میں مسلمانوں اور عیسائیوں کے فرائض اور حقوق کیا ہوں گے اور اُن کی شدھی کی کیا شرائط ہوں گی۔"

"ملاپ" لاہور، ۲۵ مئی سنہ ۱۹۲۵ء

اُس وقت یہ ذہنیت اس قدر سرایت کر گئی تھی کہ راجے اور مہاراجے رعیت پروری کی بجائے خطرناک قسم کے تعصب کے شکار بن گئے تھے۔ اس سلسلے میں مشہور کشمیر شناس اور کشمیر دوست سر والٹر لارنس نے ایک واقعہ بیان کیا ہے۔

"مہاراجہ جودھپور کے بھائی مسلمانوں سے نفرت کرتے تھے لیکن مجھے اس نفرت کی گہرائیوں کا اندازہ اُس وقت ہوا جبکہ میں ہندوستان سے واپس جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ وائسرائے نے میرے اعزاز میں ایک رخصتی ڈنر کا اہتمام کیا تھا۔ جس میں سر پرتاپ سنگھ بھی آیا۔ مسٹر پرتاپ نے کہا کہ میرا مقصدِ زندگی یہ ہے کہ مسلمانوں کو ہندوستان سے فنا کر دوں۔"

کشمیر میں مہاراجہ نے اپنے نعرۂ انصاف کے باوجود ایک ایسی یک طرفہ معتصب اور ظالم سرکار چلائی کہ ۱۹۳۱ء میں اس کے خلاف ایک ریاست گیر تحریک اُٹھی جو ریاست کی تحریکِ آزادی کا روپ دھارن کر گئی۔ یہ بات قابلِ غور ہی نہیں قابلِ ذکر بھی ہے کہ ۱۳ جولائی سنہ ۱۹۳۱ء کو جن پُرامن مظاہرین پر سنٹرل جیل سرینگر کی ڈیوڑھی کے باہر گولی چلائی گئی وہ "انصاف زندہ باد" کا نعرہ لگا رہے تھے لیکن مہاراجہ کا انصاف تو ہاتھی کے دانت تھا۔ جو کھانے کیلئے اور دکھانے کیلئے اور ہوتے ہیں۔ اُن بیچاروں کو انصاف بندوق کی نالی سے چھوٹنے والے دھماکے کی شکل میں ملا۔

اگرچہ سنہ ۱۹۳۱ء میں کشمیر کی تحریک بے انصافی اور ظلم و جبر کیخلاف اُٹھی تھی لیکن مہاراجہ اُس کے وظیفہ خواروں اور ہندو پریس نے اسے ایک خطرناک سازش کے طور پر پیش کیا۔ "ملاپ" اور "پرتاپ" نے تو اسے "پان اسلامزم" "اسلامی سلطنت" قایم کرنے اور کبھی "بالشویک انقلاب" لانے کا نام دیا۔ اور اس طرح سے برصغیر کے غیر مسلموں اور انگریزی سامراج دونوں کو اس معصوم اور حق بجانب تحریک کیخلاف صف آرا کرنے کی تحریک دی۔ اُن دنوں ہندو مہاسبھا کے صدر ڈاکٹر مونجے لندن میں تھے انہوں نے وہیں سے بیان جاری کیا کہ یہ ایک ہندو ریاست کے خلاف مسلمانوں کی سازش ہے اور برطانوی حکومت کو اس سرحدی ریاست میں مسلمانوں کی یہ "خرمستیاں" برداشت نہ کرنی چاہیے۔ ایک اور بڑے ہندو فرقہ پرست لیڈر ڈاکٹر کھرے مظفرآباد پہنچے اور وہاں ہندوؤں کی ایک میٹنگ میں کہا کہ کشمیر کے ہندو راج کی رکھشا ہمارا

دھرم ہے اور جب تک کشمیر میں شورش پسندوں کو کچل نہیں دیا جاتا۔ اُس وقت تک آرام سے بیٹھا نہیں جا سکتا۔ اس مرحلے پر "ملاپ" کے ایڈیٹر مہاشہ خوشحال چند نے اپنے دستخطوں سے یہ اداریہ شائع کیا۔

"ریاست جموں و کشمیر میں مسلمانوں کا بغاوت کیلئے تیار ہونا ایک سازش کا نتیجہ ہے ضرورت ہے کہ اس سازش کا قلع قمع کیا جائے اور اس کے جو بیج اس وقت کشمیر میں پھوٹ رہے ہیں اُن کو اکھاڑ باہر پھینکا جائے"

(بحوالہ "ملاپ" ۱۷ جولائی سنہ ۱۹۳۱ء صفحہ ۳)

"ملاپ" کے کچھ اور اشتعال انگیز بیانات ملاحظہ ہوں:۔

"کشمیر اس وقت سنکٹ میں ہے۔ اس پر غلاموں نے شورش کر رکھی ہے۔"

("ملاپ" یکم نومبر سنہ ۱۹۳۱ء صفحہ ۵)

"اگر کشمیر میں مسلمان غالب ہو گئے اور کشمیری ہندوؤں کو نقصان پہنچا۔ تو ہندوستان کے ۲۸ کروڑ ہندوؤں کی حالت خطرے میں ہو جائے گی ہمیں مٹانے کی تیاری کشمیر میں ہو چکی ہے۔ اب پنجاب کے ہندوؤں کو جاگنا چاہیے۔ ورنہ اُن کی حالت کشمیر جیسی ہو جائے گی۔"

("ملاپ" ۳۱ اکتوبر سنہ ۱۹۳۱ء صفحہ ۱۴)

"ہندوستان کے ہندو اگر اس ریاست کو بچانا چاہتے ہیں تو انہیں آرام طلبی کو چھوڑ کر جد و جہد کرنا ہوگی۔۔۔۔ وقت ہے جاگو سنبھلو اور راکھشوں کے جنگل میں پھنسی ہوئی ہندو سلطنت کو بچاؤ۔" ("ملاپ" ۱۴ نومبر)

اس حالت میں "ملاپ" کا دوسرا ساتھی وار "پرتاپ" کیوں خاموش رہتا۔ چنانچہ مہاشہ کرشن نے لکھا۔

"کشمیری مسلمان تو کشمیر کی حکومت پر خود قابض ہونا چاہتے ہیں۔ انہیں اس کا خمیازہ اُٹھانا پڑے گا۔"

اتنا ہی نہیں ایک اخبار نے تو کشمیری مسلمانوں کے خلاف فساد و عناد کی آگ بھڑکانے کیلئے یہاں تک لکھا:۔

"کشمیر کے چاروں طرف مسلمان حکومتیں ہیں۔ کشمیر پر اگر اسلامی جھنڈا لہرایا۔ تو برطانوی حکومت کیلئے خطرناک ہوگا۔"

"یہ صورتحال اتنی بڑھ گئی کہ برطانوی دارالعوام میں وزیر اعظم کو بتانا پڑا کہ "کشمیر کی بدامنی میں بالشویکوں کا ہاتھ کارفرما ہونے کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔"

(ہاؤس آف کامنز پروسیڈنگس، ۲۲ فروری سنہ ۱۹۳۲ء)

اس پروپیگنڈے کا زیادہ تر زور یہ تھا کہ کشمیری مسلمان جنہیں بقول "ملاپ" ہندوؤں سے زیادہ حقوق حاصل تھے اور جنہیں بر انجمنٹ کے طور پر یہ اعلان کرنا چاہیئے کہ وہ کسی قسم کے حقوق کا مطالبہ نہیں کرتے جس حالت میں اب ہیں اسی حالت میں رہیں گے۔ (۴ اگست ۱۹۳۱ء) "پان اسلامک" تحریک چلا رہے ہیں، یہ الزام خاص طور پر لندن میں اچھالا گیا۔ اس پر کشمیریوں کے ایک محسن سر البین بنرجی جو ۱۹۲۹ء میں کشمیریوں کے حقوق پر مہاراجہ سے اختلافات کی بناء پر مستعفی ہو گئے تھے اور جنہوں نے کشمیر دربار کی بدعنوانیوں کو دنیا بھر میں بے نقاب کیا تھا، کو یہ بیان جاری کرنا پڑا۔

"ہندوستان اور انگلستان میں ایک سے زیادہ ذمہ دار اشخاص نے میری توجہ ان بیانات کی طرف دلائی ہے کہ کشمیر کے فسادات پان اسلامک تحریک کا نتیجہ ہیں۔ میں حال ہی میں سر ہری سنگھ کی ملازمت میں بحیثیت فارن و پولیٹیکل منسٹر رہ چکا ہوں اور میں نہیں چاہتا تھا کہ کشمیر کے معاملات میں شامل بحث ہو جاؤں۔ لیکن موجودہ صورت حال میں مفادِ عامہ کیلئے یہی بہتر ہوگا کہ میں ذاتی علم کی بناء پر اپنی رائے کا اظہار کروں۔ میرے خیال میں پان اسلامک تحریک ایک ہوا ہے، جس کی بنیاد شرارتی اشخاص نے رکھی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ کشمیری رعایا تمام ہندوستان میں نہایت سادہ مزاج اور قانون کا احترام کرنے والی قوم ہے۔ اور انہوں نے صدیوں تک زیر اثر پنڈتان کشمیر زحمت برداشت کی ہے۔"

کشمیری مسلمانوں کیخلاف یہ زہر افشانی کوئی الگ تھلگ واقعہ نہیں تھی بلکہ کشمیر دربار اس کی پیٹھ ٹھونک رہا تھا۔ مہاراجہ نے کشمیر کی تحریک دبانے کیلئے لاہور سے راجہ ہری کرشن کول کو لایا تھا۔ وزیر اعظم کے سنگھاسن پر بیٹھنے کے بعد وہ لاہور کے ہندو لیڈروں اور اخبارات سے باضابطہ رابطہ قائم رکھے ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنے پرسنل اسسٹنٹ جیون لال مٹو کو لاہور میں تعینات کر رکھا تھا اور وہی ان شرانگیزیوں کی تال ملا کر کشمیریوں کی عوامی تحریک کو فرقہ وارانہ رنگ دیکر یہاں کے مسلمانوں کو بدنام کر رہے تھے، خود مہاراجہ کے قریبی رشتہ دار اور کابینہ کے ایک وزیر ٹھاکر کرتار سنگھ نے دلال کمیشن کے آگے یہ بے بنیاد بیان دیا۔

"کشمیر کی تحریک کا مقصد شمالی ہندوستان میں اسلامی راج قائم کرنا ہے۔"

پین اسلامزم اور اسلامی سلطنت کا یہ راگ صرف کشمیر کی تحریک کو غلط رنگوں میں پیش کرنے کے لئے ہی نہ الاپا جا رہا

تھا بلکہ اس کا مقصد لالہ ہر دیال کی اس سکیم کے متعلق بھی ہندو رائے عامہ میں موافق فضا پیدا کرنا تھا جو اس نے پیش کی تھی۔ اور جس پر کشمیر دربار کے ہزار ہا جھوم اُٹھے تھے۔ لالہ ہر دیال ایک کٹر تعصبی ہندو مہاسبھائی تھے، ان کی سکیم کا مقصد یہ تھا کہ ریاست کشمیر اور صوبہ سرحد میں مسلمانوں کو اقلیت میں تبدیل کر کے بقول ان کے آریہ ورت کی فصیل کو ناقابل تسخیر بنایا جائے۔ اس سکیم کے متعلق لاہور کے ایک بڑے ہندو لیڈر گوکل چند نارنگ نے ۱۹۳۱ء کے اواخر میں مہاراجہ کو لکھا کہ جب تک آپ ہمارے مشوروں پر کان نہ دھریں گے۔ آپ چین کی نیند نہ سو سکیں گے۔ آپ کو کشمیر کی سرحدیں پنجاب کے ہندوؤں کے لیے کھلی چھوڑ دینی چاہئیں۔ پنجاب وسیع آبادی کا صوبہ ہے اور اگر چند لاکھ ہندو وہاں سے جا کر کشمیر میں بس جائیں تو اس سے آبادی کے تناسب میں بڑا فرق پڑ جائے گا۔ مگر شرط یہ ہے کہ ان ہندوؤں کو تبدیلی مکان کی زحمت برداشت کرنے کے لیے مناسب مراعات اور سہولیات میسر کی جائیں۔ چنانچہ آل انڈیا ہندو مہاسبھا کے فزیکل کلچر اور والنٹیر ڈیپارٹمنٹ کے سیکرٹری پدم راج جین نے مہاراجہ سے درخواست کی کہ ان کے وفد کو سرینگر آ کر رازداری میں تفصیلات طے کرنے کی اجازت دی جائے، خود پدم راج جین سرینگر آئے اور انہوں نے راجہ ہری کرشن کول اور اغلباً مہاراجہ کے ساتھ ملاقات کی، ان دنوں پنجاب کے ایک اور بڑے ہندو مہاسبھائی بھائی پرمانند کشمیر میں حالات کو دائمی طور ٹھیک بنا لینے کی ضرورت پر بھی زور دے رہے تھے۔

خود کشمیر میں بھی مسلمانوں کی اکثریت کی صورت حال پر بیزاری کا اظہار کیا جا رہا تھا۔ گلینسی کمیشن کے سلسلے میں سناتن دھرم ینگ مینز ایسوسی ایشن (یووک سبھا) سرینگر کے لیڈروں نے جو میموریل پیش کیا۔ اس میں اپنے آپ کو کشمیری پنڈت کی جگہ "کشمیری ہندو" کہلانے پر اصرار کیا گیا۔ اور یہی نام میموریل میں بھی پیش کیا گیا۔ یہ میموریل بھارت پرنٹنگ پریس لاہور میں چھپا اور اس کی ترتیب میں وہاں کے مہاسبھائیوں کا خصوصی عمل دخل رہا۔ میموریل کی ابتداء میں ہی یہ خلاف حقیقت دعویٰ کیا گیا: ——— "کشمیری ہندوؤں کی اکثریت تلوار کی نوک پر مسلمان بنائی گئی اور ان میں سے کثیر تعداد کو گھر بار چھوڑ کر ہندوستان میں پناہ لینا پڑی۔"

صاف ظاہر تھا کہ وہ کشمیر میں مسلمانوں کی اکثریت کو الٹا گھما دینے کا خواب دیکھنے والوں کی صدائے بازگشت پیدا کر رہے تھے۔ اس سے بھی حیرت انگیز بات ہے کہ میموریل میں کشمیر کے کاز سے بے وفائی کی داستان کو بھی مزے لے لے کر اور تواریخی

گواہی کی مدد سے بیان کیا گیا جس سے یہ بات بھی ضمنی طور ہی سہی واضح ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے ہم وطن بھائیوں کے خلاف اور اُن کو نیچا دکھانے اور خوار و زبوں رکھنے کے لئے کس حد تک جانے کو تیار رہتے ہیں۔

"ابھی حال ہی یعنی پچھلی صدی کی دوسری دہائی کا واقعہ ہے کہ انہوں نے (کشمیری ہندوؤں نے) ملک (کشمیر) کی حکومت بدل ڈالی۔ انہوں نے یہ کارنامہ بیربل در اور مزار در کی قیادت میں انجام دیا۔ اور انہوں نے سکھوں کو کشمیر میں لاکر اپنی اور اپنے ملک کی نجات کا سامان پیدا کر لیا۔ وہ سکھ گورنروں اور ڈوگرہ راج کے پہلے دو مہاراجوں کے زمانے میں صرف بادشاہ گر ہی نہیں رہے، بلکہ سب سے اہم انتظامی عہدوں پر بھی فائز رہے۔ مہاراجہ گلاب سنگھ اور رنبیر سنگھ کے دورِ حکومت میں کشمیری ہندو دو صوبوں کے گورنر، اکونٹنٹ جنرل، ڈیولپمنٹ منسٹر وغیرہ عہدوں پر فائز رہے۔"

اُدھر کشمیری مسلمانوں کیخلاف یہ ریشہ دوانیاں ہو رہی تھیں اور اُن کو جائز حقوق سے محروم کرنے کیلئے روٹی ایجی ٹیشن جیسے ڈھکوسلے چلائے جا رہے تھے، اُدھر کشمیری مسلمان آہستہ آہستہ جذبات کی دھند صاف ہونے کے بعد سیکولر پالٹکس کی طرف آ رہے تھے۔ کشمیری مسلمان روایتی طور پر رواداری کے حامی ہیں اور شیخ نور الدینؒ جیسے بزرگوں کی تعلیمات کی وجہ سے وہ ہندو مسلم بھید بھاؤ میں یقین نہیں رکھتے۔ ۱۹۳۲ء میں مسلم کانفرنس کے پہلے ہی اجلاس میں اس کے منتخب صدر اور تحریک آزادی کشمیر کے قائد اعظم اور بانی شیخ محمد عبداللہ نے کہا کہ "ہم مسلمانوں کے لئے جن حقوق کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ اُنہی حقوق کا مطالبہ اپنے غیر مسلم ہم وطنوں کے لئے کر رہے ہیں۔" (خطبۂ صدارت اجلاس منعقدہ پتھر مسجد سرینگر)

تحریک آزادی کشمیر جوں جوں پختہ تر ہوتی گئی۔ اس کا مزاج قومی اور سیکولر ہوتا گیا۔ شیخ محمد عبداللہ نے کشمیر کے پنڈت لیڈروں سے ملاقاتیں کیں اور انہیں اپنے سٹیج پر تقریر کرنے کیلئے بلایا۔ شیخ صاحب نے فسادات میں اُس وقت اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر ایک پنڈت لڑکی کا داہ سنسکار ممکن بنایا جب چاروں طرف شکوک و شبہات کی فضا قائم تھی۔ آخر شیخ صاحب کی کوششوں کے نتیجے میں ریاست کی سب سے بڑی عوامی تنظیم نیشنل کانفرنس سیکولر بنیادوں پر قائم ہوئی۔ شیخ صاحب کو اس اقدام کے لئے اندر اور باہر کے فرقہ پرستوں کا ہدف بننا پڑا جن میں ہندو اور مسلم فرقہ پرست دونوں شامل تھے۔ مسلمانوں کے فرقہ پرستوں نے انہیں طعنے دیئے لیکن شیخ صاحب اپنے عقیدے میں راسخ تھے۔ انہوں نے کہا کہ ہماری جد و جہد تعصب

اور مذہب کی بنیاد پر نہیں بلکہ طبقہ وارانہ اور انصاف پسندانہ اصولوں پر کھڑی ہے۔ ظالم اور مظلوم مسلمانوں میں بھی ہیں اور ہندوؤں میں بھی۔ لہٰذا اس میں دیر و حرم کی کوئی تمیز نہیں۔ ہم ظلم سے نفرت کرتے ہیں۔ ظالم سے نہیں۔ بیماری سے نفرت کرتے ہیں بیمار سے نہیں۔ اِدھر شیخ صاحب یہ جرأت مندانہ اور انسانیت نواز اقدام کر رہے تھے اُدھر اُن کے کشمیری پنڈت رفقاء اپنی ذہنیت کے ہاتھوں پر مجبور ہو کر تحریک کے سیکولر رُخ سے خائف ہونے لگے۔ وہ تحریک کی مضبوطی سے یہ نتیجہ اخذ کرنے لگے کہ ہندو مہاراجے کے راج کو زک پہنچے گی چنانچہ بزاز، کلم اور کیشپ بندھو سارے نیشنل کانفرنس سے مستعفی ہو گئے لیکن نیشنل کانفرنس کی قیادت اپنے عزائم میں مضبوط تھی۔ اُن کا رابطہ برصغیر کی سب سے بڑی سیکولر تنظیم انڈین نیشنل کانگریس سے قائم ہونے لگا۔ جواہر لال نہرو کشمیر آئے اور اُن کو بھی ہندو فرقہ پرستوں نے معاف نہیں کیا۔ بلکہ اُن کے خلاف مظاہرے کئے۔ جواہر لال نہرو کو فرقہ پرست ہندوؤں کے گڑھ شیتل ناتھ جا کر انہیں کھری کھری سُنانا پڑی اور کہنا پڑا کہ چھوت چھات کی بنا پر مسلمانوں سے کمتری کا سلوک اور نفرت کرنا چھوڑ دیں اور اُن کے ساتھ مل کر ریاست میں ایک منصفانہ اور جمہوری نظام قائم کریں۔

لیکن اس کے باوجود فرقہ پرستی کا ایک طوفان بپا ہوتا رہا۔ کشمیری پنڈت حضرات نے صرف تحریک آزادی کے بڑے دھارے سے کنارہ کشی ہی اختیار نہ کی بلکہ وہ اُس کی مخالفت میں بھی پیش پیش رہے۔ اس حد تک کہ اُنھوں نے کشمیر کی سیکولر تحریک کو نیچا دکھانے کے لئے مقامی مسلم فرقہ پرستوں سے بھی ناپاک گٹھ جوڑ کرنے میں کوئی گریز نہیں کیا۔

جواہر لال نہرو اور مولانا آزاد ۱۹۴۴ء میں کشمیر آئے یہ بات بھی ہندوستان کے فرقہ پرستوں کو ایک آنکھ نہ بھائی اور انہیں اس صحبت مند کروٹ سے اپنے مریضانہ اور متعصبانہ منصوبوں کے پسپا ہونے کا اندیشہ لاحق ہونے لگا۔ اس سے پہلے جموں میں ہندو سکھ نوجوان جتھا قائم ہو چکا تھا جس کے نیتا کویراج وشنو تھے۔ مظفر آباد کے اجلاس میں "رنبیر" جموں کے مطابق یہ قرارداد پاس کی گئی کہ کشمیر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ہندو مہاراجہ کا ہے اور یہاں مسلمانوں کو حکومت کے حقوق نہیں۔ بہرحال ہندو فرقہ پرست لیڈر ویر ساورکر ریاست کے فرقہ پرستوں کے ٹوٹے ہوئے حوصلوں میں نیا روغن ڈالنے کے لئے یہاں آئے اور انہوں نے یہاں مسلم لیگی لیڈروں کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا کہ کشمیر میں سیکولر سیاست ہندوؤں کو دھوکہ دینے کی چال ہے اور ایک قدم آگے بڑھ کر بولے کہ یہ ہندوؤں کے مجموعی مفاد کے لئے خطرے کا کارن بنے گی۔

اسی دوران سنہ ۱۹۴۶ء کا زمانہ آیا اور جموں و کشمیر نیشنل کانفرنس کے صدر شیخ محمد عبداللہ نے "کشمیر چھوڑ دو" کا انقلاب آفرین نعرہ بلند کیا۔ اس نعرے کی جہاں جواہر لال نہرو نے حمایت کی وہاں ہندوستان کا سارا غیر مسلم پریس، ہندو مہاسبھا اور دوسرے تمام فرقہ پرست عناصر ہم آواز ہو کر اس تحریک کو غنڈوں کی تحریک قرار دینے لگے اور شیخ محمد عبداللہ کو باغی قرار دے کر کیفرِ کردار تک پہنچانے کا مطالبہ کرتے رہے۔ اسی تحریک کی حمایت میں گولیوں کا نشانہ بننے والے کشمیری عوام سے ہمدردی کرنے کے لئے جواہر لال نہرو کوہالہ پہنچے تو یہ عجیب و غریب منظر دیکھنے کو ملا کہ اُن کا راستہ روکنے والوں اور اُنہیں "گو بیک" کہنے والوں میں جموں کے مہاسبھائی اور جواہر لال کے خونی رشتہ دار کشمیری پنڈت دوش بدوش کھڑے تھے۔

کشمیریوں کی نسل کشی کے منصوبے

بہرکیف۔ اب ملک کی تقسیم کے منصوبے باندھے جا رہے تھے اور ہندوستان کے مسلم اور ہندو فرقہ پرست اپنے خطرناک خاکوں میں انسانی خون کی سُرخی سے رنگ بھرنے کے لئے پر تول رہے تھے۔ مہاراجہ نے دلی کے فرقہ پرستوں کے مشورے سے ایک پرانے اور باراں دیدہ آریہ سماجی مہر چند مہاجن کو ریاست کا وزیر اعظم مقرر کر لیا۔ اُن کی نیابت پنجاب کے ایک اور گرو گھنٹال قسم کے ہندو رام اللہ بتر کر رہے تھے اور دونوں کا دل اسی میں لگا ہوا تھا کہ کسی طرح کشمیر کی مسلم اکثریت کو اقلیت میں تبدیل کرنے کا پرانا خواب پورا ہو جائے۔ آزاد ہندوستان کے قیام کے بعد اُن کو نئی دہلی کے بڑے ایوانوں میں نئی اور طاقت ور سرپرستی مل گئی۔ مہاتما گاندھی کے ہونے والے قاتل اور جواہر لال نہرو کے پرانے رقیب مل جل کر کشمیر میں ہردیال پلان کو عملی جامہ پہنانے کے لئے لنگر لنگوٹے کس رہے تھے۔

اُن کا کام آسان بنانے کے لئے اُن کے ہم پرواز پاکستانی فرقہ پرست مصروفِ عمل تھے۔ سارا کشمیر مسلم اکثریت کا علاقہ ہونے

کے باوجود اُن کی نگاہوں میں ایک کھٹکتا ہوا خار تھا۔ کیونکہ سارے برصغیر میں یہاں کی مُسلم اکثریت نے نہ صرف اُن کے دو قومی نظریئے پر ایمان لانے سے انکار کر دیا تھا بلکہ اس کے خلاف سینہ سپر کر کے کھڑے ہو گئے تھے۔ چناں چہ اُن کے سینوں کے اندر انتقام کی جوالا بھڑک رہی تھی۔ اُنہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ کشمیر پر حملہ کر دیا۔ اور بلا امتیاز مذہب و ملت کشمیری عوام کو مظالم اور لوٹ مار کا نشانہ بنایا۔ اُن کے آگے ماسٹر عبدالعزیز اور مقبول شیروانی جیسے قوم پرست اور محبِ وطن مسلمان کھڑے ہو گئے اور اپنی جان کی قیمت ادا کر کے اپنے قاید اور اپنی تحریک کے اصولوں کو سُرخ رو کر گئے۔ کشمیر میں دو قومی نظریئے کی کمر ٹوٹ گئی۔ دُنیا نے دیکھا کہ کشمیری مسلمانوں نے پاکستانی حکمرانوں کے زبانی جمع خرچ میں آنے سے انکار کر دیا۔ اور سیکولرازم کے اصولوں پر مبنی ہندوستانی جمہوریت کے ساتھ الحاق کر دیا۔ اس طرح سے اور بہت سی تکلیفات تو اُٹھانی گئیں مگر اس طرح سے مُسلم فرقہ پرستی کا منحوس بھوت کشمیر کی فضاؤں سے مار بھگا دیا گیا اور اُسے سرحد پار جا کر پناہ گزین ہونا پڑا۔

لیکن تعصب ایک ایسا پنج مُکھی راکھشس ہے کہ اس کا ایک سر کاٹ دو تو اس کا ایک اور سر اُبھر تا ہے۔ چناں چہ مُلک میں ہندو فرقہ پرستی مُسلم فرقہ پرستی کے بن باس کے بعد کچھ اور فرصت اور فراغت سے اپنے سینگ نکالنے لگی اور کشمیر میں فرقہ پرستی کی شیطانی آگ جلائے رکھنے کا مشکوک امتیاز اب اس کی پوری ملکیت بن گیا۔ ہندو فرقہ پرست اب بلا شرکت غیرے دندنانے لگے اور کشمیری مسلمانوں کو اقلیت میں تبدیل کرنے پر کمر بستہ ہو گئے۔ مارچ سنہ ۱۹۴۷ء میں پٹیالہ اور کپور تھلہ کے مہاراجے ہری سنگھ کی دعوت پر جموں آئے وہ کئی دن تک اُن کے محل میں اُن کی ضیافتوں اور مہمان نوازی کا لُطف اُٹھاتے رہے اور انہی دنوں ریاست جموں و کشمیر میں مسلمانوں کا قتل عام کرنے اور اسے ہندو اکثریت کی ریاست بنانے کا مُخفیہ منصوبہ طے پایا۔ اس کے تھوڑی ہی مدت بعد پونچھ اور کوٹلی علاقوں میں ڈوگرہ فوج نے قتل و غارت شروع کر دی۔ ہری سنگھ نے اپنے اصلی رنگوں میں آ کر اپنی مُسلم رعایا کے خلاف اُس وقت کُھلم کُھلا اعلانِ جنگ کیا جب وہ ۲۵ ر اکتوبر سنہ ۱۹۴۷ء کی رات کو پاکستانی حملہ آوروں کے خوف سے دُم دبا کر مال و متاع اور لال و جواہر کے خریطوں کے ساتھ جموں کی طرف روانہ ہوئے۔ اُنہوں نے راستے میں جگہ جگہ مُسلمانوں کو ختم کرنے کے اشارے کئے اور اس کے عینی شاہد آج بھی موجود ہیں۔ جونہی پہنچنے کے بعد رانی تارا دیوی نے احتیاط کے سارے پردے پھاڑ دیئے۔ اُس نے ایک مورتی کو گود میں لیا۔ کُھلی کار میں بیٹھ کر اپنے بال اس انداز سے بکھیر دیئے جیسے ماتم کر رہی ہو اور ہر جگہ مورتی کی بے حرمتی کے قصّے سُنا کر لوگوں کو انتقام پر اُکساتی رہیں۔ نتیجہ یہ تھا کہ اُن کے جلو میں قضا اور ہلاکت لونڈیوں کی طرح چلنے لگیں۔ فساد اور لوٹ مار کا دور دورہ شروع ہو گیا اور سارے جموں خطے میں انسانیت سوز دنگوں اور

سیکولرازم کا اب یہ حشر کیا گیا ہے کہ اکثریت سے کوئی گناہ سرزد ہو ہی نہیں سکتا۔ لیکن اقلیت سے کسی اچھائی کی توقع ہی نہیں کی جا سکتی۔ اگر پاکستان نے زبردستی اقلیتوں کو نکال دیا تو ہم عیارانہ ذرائع استعمال کر کے انہیں ختم کر رہے ہیں۔ ہندوستان کو بھارت ماتا کہہ کر یہ ہندوستان کے سیکولرازم کی توہین کر رہے ہیں کیونکہ وہ اس کو دیوی کے روپ میں دیکھتے ہیں۔ بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ ہندو تعصبیوں نے ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو آزادی حاصل کرنے کی تاریخ اس لئے ۱۵ اگست کر دی کیونکہ اُن کے مطابق ۱۴ اگست کی تاریخ بدشگون تھی۔"

دُگل صاحب نے ۱۹۳۲ء میں محمد علی جناح کے ساتھ ایک سکھ لیڈر سردار کپور سنگھ کی ملاقات کا ماجرا بیان کیا ہے:۔

"سردار کپور سنگھ کی لندن کے ہوٹل میں مسٹر جناح سے اتفاقیہ ملاقات ہو گئی۔ جناح صاحب نے کہا کہ آپ (سکھ حضرات) ہندو فرقہ پرستوں کے جھانسے میں آکر بڑی غلطی کر رہے ہیں۔ یہ لوگ کبھی آپ کو اُبھرنے نہ دیں گے۔ میری عرض داشت پر ٹھنڈے دل سے غور کیجئے ورنہ بوڑھاپے میں آپ اپنے کئے پر پچھتائیں گے۔"

دُگل صاحب نے لکھا ہے کہ "جناح صاحب کے الفاظ حرف بحرف صحیح ثابت ہوئے ہیں۔ اکثر سکھ اب اُن کی وارننگ کے الہامی ہونے کا اقرار کرتے ہیں۔"

(انڈین ایکسپریس دہلی: ۱۲ مئی ۱۹۸۲ء)

خیر یہ تو سکھ تاریخ دان کے الفاظ تھے۔ خود ہندوؤں کے حق شناس لوگ بھی اُن کے فرقہ پرستانہ عناصر کی جارحانہ روش سے خوف زدہ ہیں۔ مشہور ہندو دانشور اور ادیب نراد چودھری اپنی کتاب "دی کانٹی نینٹ آف سرسی" (THE CONTINENT OF CIRCE) میں رقمطراز ہیں۔

"ہندو صدیوں تک غلام در غلام رہے۔ بعد میں انہیں مسلمانوں اور سکھوں کی قربانیوں سے آزادی مل گئی۔ لیکن اب وہ بڑے جارحانہ موڈ میں ہیں اور یہی بات ہندوستان میں فرقہ وارانہ کش مکش اور گڑبڑ کی بنیاد ہے۔ اُن کا موجودہ رویہ اُس گڑگڑاتی ہوئی عاجزی سے کلیتاً مختلف ہے جس کا مظاہرہ وہ صدیوں تک کرتے رہے۔"

جارحانہ ہندو فرقہ پرستی کا خاص نشانہ کشمیر ہے۔ ریاستی پارلیمنٹ اب اس فرقہ پرست سازش کے لئے ہے جس کو دیکھ کر اُس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا ہے۔ وہ اب اپنی صفیں ترتیب دے کر کشمیر پر چڑھائی کے لئے کشمیری عوام اور یہاں کے مسلمانوں کو خطرے کی اس نوعیت اور شدّت کا اندازہ کر کے اس کے مقابلے کے لئے جمع کر لینی ہوگی۔ نہیں تو اقبالؔ کا یہ لرزہ خیز مصرع حقیقت کا روپ دھار سکتا ہے۔ ع

"تمہاری داستان تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں"

غلط نامہ

صفحہ نمبر	سطر	غلط	صحیح
۳	۸	"فرقہ پرستوں" کی جگہ	"فرقہ پرست" پڑھئے
۴	۱۸	"دہرے" "	"زمرے" "
۱۲	۱۱	۱۹۵۲-۵۳ء "	۱۸۵۲-۵۳ء "
۲۹	۹	مس ٹھاکر "	مس ٹکر "
۳۲	۴	تعصبیوں "	متعصبوں "

مطبوعہ: نوائے صبح پبلشنگ ہاؤس (ٹرسٹ)، زیرو برج سری نگر